ISSN 0974-7346

ستمبر ۲۰۲۶ء

جلد ۲۱۳ — عدد ۹

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں	:	سالانہ ۴۰۰/روپے۔ فی شمارہ ۴۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۱۰۰۰/روپے
		ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۸۰۰/روپے میں دستیاب ہے۔
		ہندوستان میں لائف ممبرشپ ۱۰۰۰۰/روپے ہے۔
دیگر ممالک میں	:	سادہ ڈاک ۱۷۳۰/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰/روپے

اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ای میل (ساری دنیا میں) ۴۰۰/روپے سالانہ

ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔

بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC : PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

● زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کردیا جائے گا۔ ● معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔ ● خط وکتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔ ● معارف کی ایجنسی کم ازکم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ ● کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔رقم پیشگی آنی چاہئے۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کے تصنیفی اورنشریاتی کام میں مدد کے لیےاس اکاؤنٹ پرتعاون کریں:

بینک کا نام:Punjab National Bank

اکاؤنٹ نمبر:4761005500000051

آئی ایف ایس سی:PUNB0476100

تعاون بھیجنے کے بعد تفصیلات سے ہم کو اس ایمیل پر مطلع کریں:

info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی CSR کے تحت رجسٹرڈ ہے۔اب بڑی تجارتی کمپنیاں براہ راست دارالمصنّفین کو CSR کے تحت عطیات دے سکتی ہیں۔

نوٹ: غیرممالک سے تعاون بھیجنے کے لیے بینک کی تفصیلات ایمیل بھیج کر حاصل کریں۔

Ma'arif Section: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org website: www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۱۳ | ماہ ربیع الاول ۱۴۴۸ھ مطابق ماہ ستمبر ۲۰۲۶ء | عدد ۹

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۴
مقالات		
علامہ شبلی اور مسلم گزٹ	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	۷
سفر نامہ ابن بطوطہ: ایک جائزہ	ڈاکٹر ثمامہ فیصل	۲۰
شیر شاہ سوری: ارض بنگالہ کا عظیم معمار	ڈاکٹر کمال اشرف	۲۹
مسلم معاشرے کی خرابیاں اور ان کے سدھار کی سبیل	ڈاکٹر ظفر الاسلام خان	۴۶
وفیات		
جناب عالم بدیع اعظمی مرحوم	کلیم صفات اصلاحی	۵۹
تبصرۂ کتب	ظ۔ا۔خ، ع۔ص، انیس احمد سیوانی، ک۔ص اصلاحی، ف۔اصلاحی	۶۲
ادبیات		
نعت	ڈاکٹر راہی فدائی	۷۷
نعت	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۷۸
معارف کی ڈاک	طلحہ نعمت ندوی، محمد انس فلاحی مدنی	۷۹
رسید کتب موصولہ		۸۲

مجلس ادارت

پروفیسر ڈاکٹر تقی الدین ندوی
پروفیسر شریف حسین قاسمی
پروفیسر اشتیاق احمد ظلی
ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی
ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

مرتبہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان
محمد عمیر الصدیق ندوی
کلیم صفات اصلاحی

ادارتی سیکریٹری:
ڈاکٹر کمال اختر

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱
info@shibliacademy.org

شذرات

ملک کو غیر ملکی قابضوں اور حکمرانوں کے تسلط واقتدار اور ان کے ذریعہ ذہنی وفکری احساس غلامی سے آزاد ہوئے، اسّی سال کی ایک بڑی مدت گزر گئی۔ یہ مدت ملک کی ترقی، خوش حالی اور معاشی ومعاشرتی استحکام اور امن وامان کی نعمتوں کو ان کی بلند تر سطح پر پہنچانے کے لیے کم نہیں، بلکہ دنیا کے دوسرے اور ملکوں کے لیے اس عرصہ میں موقع تھا کہ ملک عزیز آزادی کی نعمتوں سے سرفراز ہونے میں دوسروں کی نگاہ میں مثال ہی نہیں، رشک کے لائق ہو جائے۔ مگر معاشی وسیاسی استحکام اور جمہوریت کی قدروں کے احترام کے ابتدائی زمانے کے بعد جب ملک کی بنیادی فکری تخم ریزی کے برگ وبار لانے کا وقت آیا تو تنگ نظر اور تنگ دل اور صرف ایک مخصوص طبقے کے مفادات کے لیے دوسرے اور طبقوں کی نفرت اور دشمنی میں غلطاں جماعت نے آزادی اور جمہوریت کی ایسی تعبیرات تلاش اور پیش کیں اور وقت اور اپنے اغراض ومفادات کے لیے ایسی فضا تیار کر دی جس کی ذہنی آلودگی سے سیاسی اور سماجی وباؤں کی ہلاکت خیزیاں ہی ملک کا مقدر بنتی ہیں۔ اگر ماہِ اگست کے صرف اسی ہفتۂ آزادی کی خبروں کو دیکھا جائے تو پرانے مدرسوں اور مسجدوں کا قانون کے نام پر انہدام، مسجد کے نوجوان امام کی ہلاکت، اور تعلیم میں اصلاح کی آواز بلند کرنے پر ایک مسلم شہری کا قتل جیسے جرائم کا سلسلہ روزافزوں رہا۔ مولانا محمد علی جوہر جیسے محب وطن اور ملک کی آزادی پر مرمٹنے والے اور زندگی کی ہر آسائش کو آزادی کی خاطر قربان کر دینے والے اور ہندو مسلم اتحاد کے سب سے مخلص داعی، پس دیوارزنداں آزادی کی آس پر سانس لینے والے، بے مثال قائد کی شخصیت پر زبان طعن دراز کی گئی، جس نے اپنے ملک کی مکمل آزادی کے مطالبہ کی آواز حکمرانوں کے گھر میں بلند کی، جس نے غلام ملک میں زندگی کی آخری سانس کی تہمت لینا گوارا نہیں کیا، جس نے اس سیاست کا نمونہ پیش کیا، جہاں مصلحت اور خود مفادی کا گزر نہیں، جس نے سامراجیوں سے نجات کی راہیں ہموار کیں اور جو یقیناً تحریک آزادی کا سب سے بڑا داعی تھا اور جس کے ایمان کا درجہ اس شان کا تھا کہ ساری خدائی بھی مخالف ہو تو پروا نہیں کیونکہ اس کے لیے اس کا ایک خدا ہی کافی تھا۔ اس کا صلہ یہ ملا کہ ان کے نام پر قائم یونیورسٹی کو مسمار کرنے اور وہاں ای ڈی کے ذریعہ خوف ودہشت کا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پندرہ اگست کے اخبار میں یہ سرخی بھی ملی کہ ملک کے اسی فیصد مسلمان دہشت گرد ہیں۔ اسی

پندرہ اگست کے اخبار میں یہ بھی ہے کہ دہلی یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کے پوسٹ گریجویٹ نصاب میں تاریخ کے کئی پرچوں سمیت دہلی سلطنت کے متعلق اہم پرچہ شامل نہیں کیا گیا، دہلی سلطنت کی تشکیل، حکومت کی شکل، سیاسی ثقافت اور اس دور کی مذہبی و روحانی روایات جیسے مضامین پر مشتمل یہ نصاب کئی دہائیوں سے ہندوستان کی تاریخ کا بنیادی پرچہ تھا۔ شعبہ تاریخ کے ایک رکن کا یہ قول بھی اخبار نے نقل کیا کہ دہلی سلطنت کا پرچہ انڈر گریجویٹ سطح پر موجود کسی پرچے کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ تاریخ کو نصاب سے ہٹا کر اسے مٹانے کی کوشش اس وقت کی گئی جب نئی نسل کی ناراضی کی وجہ سے نہایت ناگوار ماحول میں وزیر تعلیم کو استعفیٰ دینے کے لیے مجبور ہونا پڑا۔ لیکن احساس شکست جب ندامت کے جذبات سے محروم ہو جاتا ہے تو پھر ذوق گنہ کے سزا کے بعد بڑھ جانے کو کون روک سکتا ہے۔ یوم آزادی، دراصل ہندوستان کے آئین، اس کی روح اور جمہوریت کے معانی و مفاہیم کی بازگشت اور تجدید کا نام ہے لیکن جن لوگوں نے جمہوریت کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے، ان کے لحاظ سے صدیوں کی جدوجہد کے بعد جب سیاسی اور سماجی آزادی حاصل ہوتی ہے تو وہ دوسری تمام سماجی ذمہ داریوں کے ساتھ ایک بہتر معاشی نظام کی امیدوں کو تقویت دیتی ہے۔ لیکن آزادی کی ناشکری کی صورت میں جب یہ معاشی نظام، جمہور کے لیے بے رحم بننے لگتا ہے تو سماج کی بے یقینی کو ایک بوجھ بننے میں دیر نہیں ہوتی۔ اس وقت جمہوری فرد کا یہ احساس فزوں تر ہوتا جاتا ہے کہ اس بے رحم سیاسی و معاشی نظام میں وہ محض ایک بے نام پرزہ ہے۔ شہری کی جگہ رعایا ہونے کا احساس، آزادی سے فرار کی سوچ پیدا کرتا ہے، یہی وہ بنیاد ہے جب فرد، آمریت کے سحر میں گرفتار ہونے میں اس لیے عافیت محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کی انفرادی شناخت کسی لیڈر کی مجموعی انا میں ضم ہو جاتی ہے۔ اور پھر وہ خطرہ سامنے آتا ہے جس کو آزادی سے فرار کا عنوان دیا جاتا ہے۔ اور یہیں سے آزادی کے مفہوم پر از سر نو غور کرنے کا رجحان پنپنے لگتا ہے۔ یہ محض اتفاق نہیں کہ یوم آزادی کے دو دن بعد ہی مشہور صحافی آکار پٹیل نے انگریزی کے دو لفظوں انڈیپنڈنس اور فریڈم کے عام معنی، آزادی کے ساتھ خود انحصاری کے مفہوم پر زور دیا، خود انحصاری موجودہ حکومت کا پسندیدہ اور رائج الوقت لفظ ہے، لیکن سچ یہی ہے کہ خود انحصاری بے معنی ہے اگر آزادی نہیں۔ موجودہ حالات میں اس آزادی کا حال عالمی تجزیہ نگاروں کی نظر میں یہ ہے کہ حکومت کی پابندیاں بہت زیادہ ہیں اور سماجی جارحیت بھی اسی درجہ بڑھی

ہوئی ہے۔ ملک اس طبقہ میں شامل ہو چکا ہے جہاں مذہبی کشیدگی اور تشدد کا بول بالا ہے۔ یہ تشدد منظم گروہوں کی جانب سے ہے۔ عالمی تجزیہ نگاروں کی تنظیموں کا نام لے کر بتایا گیا کہ انہوں نے موجودہ ہندوستان کو ان ملکوں کی فہرست میں شمار کیا ہے جہاں افراد یا افراد کے گروہوں کو ہراساں کرنے کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے، ایک اور تنظیم جو شہری تنظیموں کا عالمی ادارہ بھی ہے اور شہری حقوق پر نظر رکھنا اس کا مقصد ہے اس نے ہندوستان کو ایسی جگہ بتایا ہے، جہاں عوام کی حوصلہ شکنی کا رویہ، روا رکھا گیا ہے۔ یعنی شہریوں کے لیے ایک جگہ جمع ہونے کے مواقع کم ہوتے جارہے ہیں ان کی آواز کو دانستہ اور بزور دبایا جارہا ہے۔ ایک اور تنظیم جو برطانیہ کے مشہور جریدے اکنامسٹ سے تعلق رکھتی ہے، اس نے اپنے جاری کردہ جمہوری اشاریہ میں ہندوستان کو ناقص جمہوریت کے خانہ میں رکھا ہے۔ ایک قدیم تنظیم فریڈم ہاؤس کے نام سے ہے جو ۲۰۱۴ء تک ہندوستان کو آزاد ملکوں کے زمرہ میں رکھتی آئی تھی لیکن اب اس نے ملک کو جزوی آزاد کے خانے میں رکھ دیا اور بھی تنظیموں نے انفرادی اور سماجی آزادی میں انحطاط اور بدعنوانی میں اضافہ کا تحقیقی جائزہ پیش کر دیا ہے۔ ان مثالوں کو سامنے لاکر اگر سچائی سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ ملک کی شبیہ اور اس کا وقار حد درجہ مجروح اور داغ دار ہو چکا ہے تو اس سچائی کو حکومتی ذرائع ابلاغ کی تشہیری مہم سے دور اور درست نہیں کیا جاسکتا۔ حق یہ ہے کہ یوم آزادی اور لال قلعہ کی شکل میں آزادی اور جمہوریت کی تصویر اپنی زیبائی و رعنائی کی تلاش میں ہے اور یہ تلاش، وقت کی ضرورت بن چکی ہے۔

***

دارالمصنّفین کی علمی و عملی سرگرمیوں میں اس کی مجلس انتظامیہ کے سالانہ اجلاس کا اہم کردار رہتا ہے۔ الحمد للہ اس سال بھی اراکین مجلس انتظامیہ، ادارہ کے امور اور مہمات مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے جمع ہوئے۔ درپیش مسائل میں ادارہ کا مالیاتی استحکام بھی اراکین کی فکر اور توجہ کا مرکز رہا۔ اس سال آٹھ نئے اراکین، ڈاکٹر ایاز احمد اصلاحی، ڈاکٹر وارث مظہری، پروفیسر شباب الدین، پروفیسر محی الدین آزاد، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، پروفیسر نسیم احمد، سی اے محمد نعمان اور ڈاکٹر محمد دانش، مجلس میں شامل کیے گئے۔ تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف اور طب اور مالی انتظام کے لحاظ سے ان تمام حضرات کی کارکردگی سے ایک دنیا واقف ہے۔ ان کی خدمات حاصل ہونے سے دارالمصنفین کی روایتی شان میں ان شاء اللہ اضافہ ہی ہوگا۔

***

علامہ شبلی اور مسلم گزٹ

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دارالمصنّفین اعظم گڑھ
azmi408@gmail.com

عہد شبلی میں ہندوستانی مسلمانوں کے پاس مولانا ابوالکلام آزاد (۱۸۸۸-۱۹۵۸) کے ”الہلال“ کے سوا اپنا کوئی ایسا آزاد سیاسی اخبار نہیں تھا جو خاص ان کے مسائل و معاملات کو آزادی و بے باکی سے عوام کے سامنے پیش کرتا۔ علامہ شبلی نعمانی (۱۸۵۷-۱۹۱۴) کو اس کمی کا احساس عرصہ سے تھا، چنانچہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کی معتمدی کے زمانے میں انہوں نے اپنی رہائش کے لیے امین آباد پارک کی شمالی قطار میں ایک بالاخانہ کرایہ پر لیا تھا۔ اس سے ملحق سید میر جان، جو لکھنؤ کے ایک بڑے باذوق رئیس تھے اور لکھنؤ کی ادبی سرگرمیوں میں شامل رہتے تھے، نے امین آباد میں ایک ریڈنگ روم قائم کیا تھا۔ وہ اکثر علامہ شبلی سے ملاقات کے لیے آیا کرتے تھے۔ ان کی اور علامہ شبلی کی یکجائی ہوئی اور دونوں میں رسم و راہ بڑھی اور ملی و سیاسی مسائل پر گفتگو شروع ہوئی تو علامہ شبلی نے سید میر جان کو ایک آزاد اخبار کے اجرا کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ اس کے تبادلے میں ملک کے اخبارات و رسائل بھی آئیں گے اور صحیح خیالات کی اصلاح و ترویج ہوگی، چنانچہ سید میر جان نے اس مشورے کو اس شرط کے ساتھ قبول کیا کہ اس کے مضامین کی ذمہ داری آپ اپنے ذمہ لے لیں تو اسے جاری کیا جائے۔ علامہ شبلی نے ان کی یہ شرط منظور کر لی اور جنوری ۱۹۱۲ء میں سید میر جان نے ”مسلم گزٹ“ کے نام سے ایک اخبار لاٹوش روڈ لکھنؤ سے جاری کیا۔ علامہ شبلی نے اس میں پوری دلچسپی لی اور مولوی وحید الدین سلیم (۱۸۶۹ء-۱۹۲۷) کا جو ماہنامہ ”معارف“ علی گڑھ اور سرسید کے ”علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ“ کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے تھے اور عمدہ ادارت کے لیے شہرت رکھتے تھے، ”مسلم گزٹ“ کی ادارت کے لیے انتخاب عمل میں آیا۔ اس کے لیے علامہ شبلی نے علی گڑھ جاکر مولوی وحید الدین سلیم سے ملاقات کی۔ یہ ملاقات مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳-۱۹۳۰ء) کے یہاں مولانا اقبال احمد خاں سہیلؔ (۱۸۸۴- ۱۹۵۵ء) کی موجودگی

میں ہوئی تھی جو اس وقت ایم اے او کالج علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ یہ دونوں بزرگ علامہ شبلی کے ہم وطن اور شاگرد تھے۔

مولوی وحید الدین سلیم کے والد سے علامہ شبلی کا کسی معاملہ میں اختلاف ہو گیا تھا، جس کی وجہ سے وہ علامہ شبلی سے کسی قدر شاکی بلکہ مخالف تھے اور موقع بے موقع ان پر تنقید کیا کرتے تھے۔ باوجود اس کے علامہ شبلی نے ان کی ادارتی صلاحیتوں اور علم وادب پر گہری نگاہ کی وجہ سے "مسلم گزٹ" کی ادارت کے لیے نہ صرف انہیں پسند کیا بلکہ علی گڑھ جا کر ان سے ملے اور سارے پرانے گلے شکوے دور کر کے انہیں "مسلم گزٹ" کی ایڈیٹری کے لیے راضی کر کے لکھنؤ لائے اور اپنی رہائش ہی کے قریب ان کی رہائش کا انتظام کرایا۔ اس طرح جنوری ۱۹۱۲ء میں "مسلم گزٹ" کا اجرا عمل میں آیا۔ مسلم گزٹ نے بہت کم عمر پائی، محض دو سال ۱۹۱۲-۱۹۱۳ کی مختصر مدت میں بند ہو گیا۔

"تاریخ صحافت" کے مصنف مولانا امداد صابری (۱۹۱۴- ۱۹۸۸ء) نے "مسلم گزٹ" کے اجرا کا سنہ ۱۹۱۳ء لکھا ہے اور اس کا ذکر ۱۹۱۳ء میں شائع ہونے والے اخباروں کے ضمن میں کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> لکھنؤ سے جنوری ۱۹۱۳ء کو یہ ہفتہ واراخبار وجود میں آیا، جو آٹھ صفحوں پر مشتمل تھا۔ سید وحید الدین سلیم اس کے ایڈیٹر تھے، سالانہ چندہ مع محصول ڈاک ڈھائی روپے تھا۔[1]

مولانا سید سلیمان ندوی (۱۸۸۴ء-۱۹۵۳ء) نے "مسلم گزٹ" لکھنؤ کے اجرا کا سال اپنے مضمون "لکھنو کی ادبی خدمات" (مشمولہ انتخاب مضامین سید سلیمان ندوی) میں ۱۹۱۰ء لکھا ہے، البتہ بعد میں جب انہوں نے 'حیات شبلی' لکھی تو اس میں 'مسلم گزٹ' کا صحیح سنہ اجراء ۱۹۱۲ء لکھا، لیکن اس کی اشاعت کا مہینہ کسی نے نہیں لکھا ہے۔ رئیس الاحرار مولانا سید فضل الحسن حسرت موہانی (۱۸۷۵-۱۹۵۱ء) کی ایک تحریر سے اس کی اہمیت کے ساتھ اس کی اشاعت کے مہینے کا بھی علم ہوتا ہے۔ وہ فروری، مارچ ۱۹۱۲ء کے "اردوئے معلی" علی گڑھ جو انہی کی ادارت میں نکلتا تھا، میں اس کے متعلق لکھتے ہیں:

> جنوری ۱۹۱۲ء سے اس (مسلم گزٹ) نام کا ایک ہفتہ وار قومی، سیاسی، ادبی اور تمدنی اردو اخبار لکھنؤ

---

[1] امداد صابری، تاریخ صحافت، ناشر فرید بک ڈپو، دہلی، طبع جدید ۲۰۲۴ء، جلد پنجم، حصہ دوم، ص ۴۸۸

سے نکلنا شروع ہوا ہے۔ اس اخبار کی تقطیع ۴/ ۲۰ × ۲۶ تمام موجودہ اردو اخباروں سے بڑی ہے، اس لیے اس کے آٹھ صفحوں کا مضمون دوسرے اخباروں کے ۱۶/ صفحوں سے بھی کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ مسلمان اخبار عموماً سرسید کی غلط سیاسی پالیسی کے پیرو ہونے کے علاوہ پریس ایکٹ کی سختیوں سے اس درجہ خوف زدہ ہوگئے ہیں کہ ان کی تحریروں میں جدت خیال یا آزادی رائے کی تلاش ہمیشہ بے سود ثابت ہوا کرتی ہے، چنانچہ 'مسلم گزٹ' کو بھی ہم اس نقص عام سے بری نہیں کہہ سکتے تاہم اتنا ضرور ہے کہ دیگر مسلمان اخباروں کے مقابلہ میں اس کے مضامین نسبتاً زیادہ آزاد اور اس کی رائے زیادہ بے باک ہوتی ہے۔ لٹریچر کے اعتبار سے غالباً صرف اتنا بتادینا کافی ہوگا کہ اس کے ایڈیٹر مولوی سید وحید الدین سلیم ہیں، جن کے قلم کا زور "معارف"، اور "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کے صفحوں پر بارہا نمودار ہو کر اہل نظر سے اپنے کمال کی داد حاصل کر چکا ہے۔ (۲)

چونکہ "مسلم گزٹ" کا ذکر مولانا امداد صابری نے "تاریخ صحافت" میں ۱۹۱۳ء کے ذیل میں کیا ہے اس لیے اندرونی صفحات بلکہ بعض اقتباسات میں بھی کئی جگہ ۱۹۱۲ء کو ۱۹۱۳ء بنادیا گیا ہے، حتیٰ کہ مولانا حسرت موہانی کے مذکورہ بالا اقتباس میں بھی ترمیم کر کے جنوری ۱۹۱۲ء کو جنوری ۱۹۱۳ء کر دیا گیا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ "مسلم گزٹ" ۱۹۱۳ء میں نہیں جنوری ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا۔ ۱۹۱۳ء کے ذیل میں اس کا ذکر "تاریخ صحافت" کے مصنف کا سہو ہے۔ البتہ اس کے متعلق تحریروں میں ۱۹۱۲ء کو ۱۹۱۳ء کس شخص نے بنایا؟ کمپوزر نے یا طبع جدید کے مرتب اور تزئین نگار نے؟ صحیح طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ واضح رہے کہ "تاریخ صحافت" کا نیا ایڈیشن فرید بک ڈپو دہلی نے ۲۰۲۴ء میں اس کی تمام جلدوں کو دو جلدوں میں یکجا کر کے شائع کیا ہے۔ یہ اس لحاظ سے فرید بک ڈپو دہلی کا اہم کام ہے، کیونکہ "تاریخ صحافت" برسوں سے دستیاب نہیں تھی، البتہ اس کی ترتیب و تزئین فاروق ارگلی صاحب نے کی ہے۔ ادھر ان کے جو کام بھی فرید بک ڈپو دہلی سے جمع و تدوین کے سامنے آئے ہیں وہ رواروی کی مثال بن گئے ہیں۔ ہمارے یہاں یعنی اردو میں کسی کتاب کی ترتیب یا ترتیب نو وغیرہ کی بات سمجھ میں آتی ہے، لیکن اس میں تزئین کیا ہے اور ترتیب و تدوین کے ضمن میں تزئین کا کون سا کام شامل ہے، راقم کو معلوم نہیں۔ غالباً کمپوزنگ کرانے،

---

(۲) حسرت موہانی، ریویو مسلم گزٹ، ماہنامہ اردوئے معلیٰ، علی گڑھ فروری/ مارچ ۱۹۱۲ء، ص: ۱۸-۱۹

پروف ریڈنگ کرنے اور سرورق پر اپنانام درج کرانے کو تزئین کا نام دیا گیا ہے۔ بہر کیف قدیم کتب کی جدید اشاعت میں "تزئین" سمجھ سے بالاتر ہے۔ البتہ "تاریخ صحافت" کے طبع جدید میں ترتیب و تدوین کا بھی بظاہر کوئی کام نظر نہیں آتا۔ نہ حواشی لکھے گئے ہیں اور نہ اغلاط پر داد تحقیق و تصحیح دی گئی ہے، بس کمپوز کرا کے چھاپ دی گئی ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ "تاریخ صحافت" طبع اول میں فہارس اخیر میں تھیں، طبع جدید میں انہیں ابتدا میں شامل کیا گیا ہے۔

طبع جدید میں جہاں جہاں "مسلم گزٹ" کے مؤسس و بانی سید میر جان کا نام آیا ہے، اسے کمپوزر نے یا تزئین کار نے ہر جگہ میر جمال کر دیا ہے۔ یہ واضح غلطی بھی مرتب کی تصحیح سے محروم ہے۔ بہر کیف "تاریخ صحافت" کا یہاں تعارف و تجزیہ مقصود نہیں بلکہ مستقبل کی اشاعت میں تصحیح کے خیال سے ان چند اغلاط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سید میر جان کے اخلاص، مولوی وحید الدین سلیم کے تجربے اور علامہ شبلی کی توجہ اور سرپرستی سے 'مسلم گزٹ' نے بہت جلد قبولیت کے آسمان میں اپنی جگہ بنالی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ:

> الحمدللہ! مسلم گزٹ اپنے محاسن معنوی میں روز بہ روز ترقی کر رہا ہے۔ آج کل عربی اخبارات کے ترجمے اور جنگ کی ہر طرح کی خبروں کا جس قدر ذخیرہ اس میں جمع کیا جاتا ہے اس کی نظیر کسی اخبار میں نہیں مل سکتی، قیمت نہایت معقول یعنی صرف دو روپیہ بارہ آنے۔ ناظرین الہلال میں سے جو صاحب اب تک اس کے خریدار نہیں ہیں انہیں ہم صداقت کے ساتھ مشورہ دیتے ہیں کہ ضرور خریدار بنیں۔ (۳)

مولانا ابوالکلام آزاد "مسلم گزٹ" کی آزادی رائے اور بلا خوف لومۃ لائم کے لیے داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مسلم گزٹ لکھنؤ نے موجودہ سیاسی تغیرات، خیالات کی تولید میں سب سے زیادہ نمایاں حصہ لیا اور اس خدا پرستانہ دلیری اور حق گویانہ آزادی کے ساتھ صدا بلند کی کہ فی الحقیقت "لا یخافون لومۃ لائم" کے نفوس خاص میں اس کا شمار ہے۔ (۴)

---

(۳) الہلال، کلکتہ / نومبر ۱۹۱۲ء

(۴) الہلال، ۲۹/ دسمبر ۱۹۱۲ء

بابائے اردو مولوی عبدالحق (۱۹۶۱-۱۸۷۰ء) نے مولوی سید وحید الدین سلیم کی وفات پر انجمن ترقی اردو کے مجلہ "اردو" میں جو مضمون لکھا ہے، اس میں بھی "مسلم گزٹ" اور مدیر مرحوم کی ادارت کی تعریف و تحسین فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

مرحوم علاوہ ایک بلندپایہ ادیب ہونے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کے اخبار نویس بھی تھے۔ 'مسلم گزٹ' کے پرچے جن صاحبوں نے بہ غور پڑھے ہیں انہیں معلوم ہے کہ ایسے زبردست مضامین مسائل وقت پر کسی دوسرے اخبار میں نہیں نکلے۔[۵]

گو "مسلم گزٹ" کے ایڈیٹر مولوی وحید الدین سلیم تھے اور اگست ۱۹۱۳ء تک رہے اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بقول "مولانا (شبلی) اس اخبار میں کبھی اپنے نام سے اور کبھی بے نام کے مضامین اور نوٹ لکھتے تھے، اس سے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ یہ خاص مولانا (شبلی) کا اخبار ہے"۔[۶]

مسلم گزٹ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۱۳ء تقریباً دو برس تک نکلتا رہا۔ ۱۹۱۲ کے شمارے راقم کو دستیاب نہیں ہوئے۔ البتہ ۱۹۱۳ء کے متعدد شمارے راقم کی نظر سے گذرے ہیں، چونکہ تمام شمارے دستیاب نہیں ہوئے، اس لیے اس میں علامہ شبلی کی مطبوعہ تحریروں کی صحیح تعداد معلوم نہیں ہو سکی، لیکن جو کچھ سرمایہ "مسلم گزٹ" اور دیگر حوالوں سے دستیاب ہوا ہے وہ کچھ کم اہمیت کا حامل نہیں ہے بلکہ مولانا سید سلیمان ندوی کی رائے کی تصدیق کرتا ہے، جس کا ذکر آئندہ سطور میں آرہا ہے۔

پھر یہ ہوا کہ جلد ہی مولوی وحید الدین سلیم علامہ شبلی مرحوم کے متعلق اپنے قدیم خیال پر واپس آگئے اور ندوہ کے مولوی عبدالکریم کی معطلی کے معاملہ اور ندوہ کی اسٹرائک پر علامہ شبلی کے خلاف بڑے سخت مضامین لکھے اور شائع کئے۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے مخالفین شبلی سے رابطہ کرکے ان سے علامہ شبلی کے خلاف مضامین اور مراسلات لکھوائے اور شائع کیے اور ایسی ایسی تحریریں شائع کیں کہ علامہ شبلی کو سخت مجرم اور نہ جانے کیا کیا ثابت کرنے کی کوشش کی، "مسلم گزٹ" کا یہ حصہ محسن کشی کی ایک مثال ہے۔

---

[۵] مجلہ اردو، جنوری ۱۹۲۹ء، ص: ۳۲

[۶] سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵، ص: ۵۷۱

مولوی عبدالکریم نے ماہنامہ الندوہ میں ”جہاد“ پر ایک مضمون لکھا جو قابل اعتراض ٹھہرا، چنانچہ انہیں ندوے سے معطل کر دیا گیا۔ یہ معطلی معتمدین کی متفقہ رائے سے ہوئی تھی۔ اس پر جب واویلا مچا تو اس کی تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر ڈال دی گئی۔ چنانچہ علامہ شبلی کے خلاف مختلف اخبارات میں مضامین اور مراسلات چھپے۔ اس میں پیش پیش انہی کی سرپرستی میں نکلنے والا اخبار مسلم گزٹ تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ”مسلم گزٹ“ کے سرپرست علامہ شبلی ہیں، مولوی سید وحید الدین سلیم نے ان کے خلاف نہ صرف مضامین اور اداریے لکھے بلکہ مخالف اہل قلم سے رابطہ کر کے اس موضوع پر مضامین اور مراسلات باصرار لکھوا کر شائع کیے۔ اس سلسلے کی متعدد تحریریں مسلم گزٹ میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کا مطالعہ و جائزہ طوالت کا باعث ہو گا، البتہ اس کے چند عناوین یہاں لکھے جاتے ہیں، جس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مخالفین شبلی کی مخالفت کس سطح کی تھی۔ مثلاً: ”ندوہ میں ایک عجیب واقعہ مولانا شبلی اپنے اصلی جامہ میں“ (۹، اپریل ۱۹۱۳)، ”مولانا شبلی کی دھمکی“ (۱۶، ۱۹۱۳)، ”مولانا شبلی کی ملمع سازی“ (۲۳، اپریل ۱۹۱۳)، ”توبر دن درچہ کر دی کہ درون کعبہ آئی“ (ایضاً)، ” البشیر کی غلط فہمی“ (ایضاً)، ”حرم میں یونیورسٹی“ (نظم) وغیرہ۔

اخیر میں مولانا سید عبدالحی حسنی میدان میں آئے اور براہ راست خط لکھنے کے بجائے مسلم گزٹ کے ذریعہ علامہ شبلی کے نام خط لکھا اور تمام تر ذمہ داری علامہ شبلی کے سر منڈھ دی (۱۱، جون ۱۹۱۳)۔ اب تک علامہ شبلی نے کسی کا جواب نہیں لکھا تھا۔ دراصل اس دوران وہ علیل رہے۔ ان سب مضامین و مراسلات کے جواب میں علامہ شبلی نے ایک خط بنام مولانا سید عبدالحی حسنی لکھا جو مسلم گزٹ ہی (۱۱ جون ۱۹۱۳) میں چھپا۔ سچ یہ ہے کہ اس ایک خط نے تمام مراسلہ لکھنے والوں اور خود مدیر کے خیالات کے تار و پود بکھیر دئے۔ طوالت کے سبب اقتباسات اور تفصیلی جائزہ سے احتراز کیا جاتا ہے۔ مسلم گزٹ کے ۱۹۱۳ کے متعدد شمارے خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں محفوظ ہیں۔

علامہ کی ان تضحیکات سے تنگ آکر تلامذہ شبلی بالخصوص مولانا عبدالسلام ندوی (۱۸۸۳۔ ۱۹۵۶) نے مدیر کے خلاف مراسلات لکھے۔ اس سلسلے کے بعض مراسلات مسلم گزٹ ہی میں چھپے ہیں (۱۰ ستمبر ۱۹۱۳)، یہاں تک کہ مولانا مسعود علی ندوی نے علامہ شبلی سے گزارش کی کہ مسلم گزٹ کی جگہ لکھنؤ ہی سے کیوں نہ اس کا جانشین جاری کیا جائے (مکاتیب شبلی، اول، ص: ۲۷۲)۔

علامہ شبلی نے مسلم گزٹ کی سرپرستی کے زمانے میں ملی اور سیاسی مسائل پر جو مضامین لکھے وہ اسی اخبار "مسلم گزٹ" میں شائع ہوئے۔ علامہ شبلی نعمانی کے درج ذیل مضامین "مسلم گزٹ" کے حوالہ سے "کتابیات شبلی" میں شامل ہیں۔ یہاں ان کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ انگریزی قرآن مجید کا ترجمہ اور ندوۃ العلماء[۷]: اس وقت انگریزی ترجمۂ قرآن کی مسلمانوں کو سخت ضرورت تھی، چنانچہ علامہ شبلی نے ندوۃ العلما کے سالانہ اجلاس میں انگریزی ترجمہ قرآن کے لیے ایک قرارداد پیش کی، جو منظور ہوئی۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

> قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ در حقیقت ایک نہایت ضروری کام ہے۔ یورپ کی زبانوں میں قرآن مجید کے کثرت سے ترجمے موجود ہیں اور جدید تعلیم یافتہ انہی کو پڑھتے ہیں۔ ان ترجموں میں سخت غلطیاں ہیں، اس کے علاوہ مترجموں نے اکثر جگہ حاشیہ میں اپنی طرف سے جو کچھ لکھا ہے، اس میں علانیہ قرآن مجید پر نکتہ چینیاں کرتے ہیں، مثلاً جہاں قرآن مجید میں یہ ذکر ہے کہ یہودی حضرت عزیر کو خدا کہتے تھے، اس جگہ حاشیہ میں لکھا ہے کہ "یہودیوں پر ایک افسوس ناک تہمت"۔

ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی۔ ترجمے کے لیے نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کا انتخاب عمل میں آیا۔ علامہ شبلی کے نام ان کے ۱۸/ اپریل ۱۹۱۰ء کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ "ان شاء اللہ زندگی باقی ہے تو دو سال کے اندر ختم (پورا) ہو جائے گا، سورہ بقرہ تمام اور آل عمران کا معتدبہ حصہ ختم ہو چکا ہے"۔

نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی نہایت حزم و احتیاط سے ترجمے کا کام انجام دے رہے تھے اور تقریباً ۹/ پاروں کا ترجمہ اس وقت تک ہو چکا تھا اور ۵/ پاروں کا ترجمہ چھپ بھی چکا تھا۔ علامہ شبلی چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ چنانچہ انہوں نے عمادالملک سے عرض کیا کہ آپ کی خدمت ایک معاون یہاں سے بھیج دیا جائے تو آپ کو سہولت ہوگی، اس کے اخراجات ندوہ سے ادا کئے جائیں گے مگر وہ اس کے لیے راضی نہیں ہوئے۔

علامہ شبلی نے اپنے ماموں زاد بھائی نامور عالم و مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی سے،

---

[۷] مسلم گزٹ لکھنو، ۵/ فروری ۱۹۱۲ء

جو عربی و انگریزی دونوں کے فاضل تھے، درخواست کی کہ وہ ترجمے کو ایک نظر دیکھ لیں، چنانچہ انہوں نے دیکھنا منظور کیا اور پھر دیکھ کر ایک یادداشت لکھ کر بھیجی۔ تقریباً دو برس اور یہ کام اسی طرح چلتا رہا، یہاں تک کہ پندرہ یا سولہ پارے کا ترجمہ ہو گیا تھا کہ ۱۸؍نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی اور ان کے اور بہت سے عزائم کی طرح یہ خواب بھی خواب ہی رہ گیا اور جس قدر ترجمہ ہو گیا تھا وہ بھی چھپ نہیں سکا۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> انگریزی ترجمۂ قرآن کی تجویز قریب قریب پوری ہو چکی تھی۔ نواب عمادالملک بلگرامی نے جو اپنے زمانہ کے بے نظیر انگریزی انشاپرداز تھے، مولانا (شبلی) کی تحریک سے پندرہ پاروں تک ترجمہ کر چکے تھے، جو مطبوعہ مسودہ کی صورت میں اب تک موجود ہے پھر مولانا حمیدالدین صاحب مرحوم جب دارالعلوم حیدرآباد پرنسپل ہو کر گئے تو نواب صاحب نے ان کے مشورے واستصواب سے اپنے ترجمہ کے کئی پاروں پر نظر کی۔
>
> نواب صاحب کی وفات کے بعد جب میں نے یہ مسودہ نواب صاحب مرحوم کے خلف الرشید نواب مہدی یار جنگ بہادر وزیر سیاسیات و تعلیمات سرکار نظام سے منگوا بھیجا تو اس نظر ثانی شدہ مسودہ کا پتہ نہ چلا، جس کا بہت افسوس ہے۔[۸]

۲۔ مجلس علم کلام:[۹] علامہ شبلی کا خیال تھا کہ جدید علم کلام ناقص اور نامکمل ہے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ عباسیوں کے زمانے میں جب فلسفہ اور علوم عقلیہ کا رواج ہوا تو سیکڑوں ہزاروں اشخاص کے مذہبی عقائد متزلزل ہوگئے۔[۱۰] چنانچہ مسلمانوں میں علوم عقلیہ اور فلسفہ کے ماہرین پیدا ہوئے اور انھوں نے اس سیلاب کو روکا۔ موجودہ دور میں جب کہ یورپ کی تحقیقات عام ہو رہی ہیں اور جدید خیالات قوم میں پھیل رہے ہیں، علماء میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جس نے یورپ کا فلسفہ اور سائنس حاصل کیا ہو۔[۱۱] اس لئے ضروری ہے کہ ایک کمیٹی "مجلس علم کلام" بنائی جائے، جس میں بقول علامہ شبلی:

> قدیم علماء اور جدید تعلیم یافتہ دونوں گروہ کے لوگ ممبر ہوں۔ قدیم علماء اس بات کا فیصلہ کریں کہ

---

[۸] علامہ شبلی نعمانی، مقالات شبلی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰، جلد ۸، ص: ۹

[۹] ہفت روزہ مسلم گزٹ لکھنو، ۴؍مارچ ۱۹۱۲ء

[۱۰] مقالات شبلی، ج ۸، ص ۵۳

[۱۱] ماخذ سابق، ص ۵۴

جو عقائد اور مسائل فلسفہ کے خلاف بیان کئے جاتے ہیں ان میں سے کون سے مسائل درحقیقت اسلام کے اصل عقائد ہیں اور کون سے نہیں۔ جدید تعلیم یافتہ گروہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ جن چیزوں کو فلسفہ کہا جاتا ہے وہ درحقیقت فلسفہ کے مخالف ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو فلسفہ کی تحقیقات کہاں تک یقینی اور قطعی ہے۔[۱۲]

اس کمیٹی میں انھوں نے قدیم وجدید تعلیم یافتہ دونوں طبقہ کے اشخاص کو شامل کیا تھا، جس میں مولانا مفتی عبد اللہ ٹونکی، مولانا حمید الدین فراہی، علامہ سر محمد اقبال اور مولوی عبد القادر بی اے شامل تھے۔[۱۳]

اس سلسلے میں انھوں نے مذکورہ اشخاص سے خط وکتابت کی اور اسے ایک مجلس کی شکل دینے کی کوشش کی۔ علامہ اقبال کے علاوہ کسی اور کے رکنیت قبول کرنے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ کام اس سے زیادہ غالباً آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ خود علامہ شبلی نے علم الکلام کی اردو میں ترتیب و تدوین کے لئے بڑی جدوجہد کی اور اس کا ایک وسیع اور مہتم بالشان علمی منصوبہ بنایا تھا جو اگرچہ پورا نہ ہو سکا تاہم اس سلسلے کی انہوں نے کئی اہم کتابیں سپرد قلم کیں۔ علامہ شبلی نے ایک صدی پہلے یہ منصوبہ بنایا تھا۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے یہ کام اور زیادہ ضروری اور اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ سائنسی تحقیقات کا یہ دور عروج ہے۔ روز نت نئے انکشافات اور ایجادات ہو رہے ہیں، اس لیے علامہ شبلی کے دور کے مقابلہ میں آج مجلس علم کلام اور اس کے مقاصد کا حصول وقت کا شاید سب سے بڑا تقاضا ہے مگر اب کون اس جانب متوجہ ہو گا اور ہو گا بھی جیسا کہ بعض کتابیں منظر عام پر آئی ہیں تو ان سے کون تعارض کرے گا۔

۳۔ مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ:[۱۴] علامہ شبلی کی یہ تحریر ان کا انتہائی اہم اور معرکۃ الآراء مقالہ ہے۔ یہ دراصل ان کی سیاسی فکر کی نمائندہ تحریر ہے جو ۱۹۱۲ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کے زمانے میں لکھی گئی اور بقول مولانا سید سلیمان ندوی "یہ مضمون اس قدر مدلل اور پرجوش تھا کہ اس نے

---

[۱۲] مقالات شبلی، ج۸، ص:۵۴-۵۵

[۱۳] ماخذ سابق، ج۸، ص:۵۴

[۱۴] ہفت روزہ، مسلم گزٹ لکھنؤ، قسط اول:۱۲/ فروری ۱۹۱۲ء، قسط دوم:۴/ مارچ ۱۹۱۲ء، قسط سوم:۹/ اکتوبر ۱۹۱۲ء

مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا"۔[۱۵]

اس مضمون کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

اگر یہ سچ ہے کہ تقسیم بنگال کے طمانچے سے مسلمانوں کی پالیٹکس کا منہ پھر گیا تو ہم رضامند ہیں کہ اس تقریب مسرت میں بنگال کے سوا کچھ اور بھی نذر کر دیا جائے، لیکن مرکز پالیٹکس اور اس کے حوالے سے جو صدائیں آتی ہیں، زود فنا ہونے کے ساتھ خود ان کا لہجہ بھی غلط ہے۔

"پانیر" کا مسلمان نامہ نگار لکھتا ہے کہ "چوں کہ اب نظر آتا ہے کہ ٹرکی اور ایران کے کمزور ہونے کی وجہ سے ہمارا فارن رتبہ قائم نہیں رہے گا، اس لیے ہم کو ہندوؤں سے مل جانا چاہیئے"۔ ہندوؤں سے ملنا اچھی بات ہے، یہ ہمیشہ سے اچھی بات تھی اور ہمیشہ اچھی بات رہے گی، لیکن نامہ نگار نے جو جدید ضرورت بیان کی ہے، وہ اسلام کا ننگ ہے۔[۱۶]

اس میں علامہ شبلی نے مسلم لیگ اور سرسید احمد خاں کے سیاسی نقطۂ نظر پر سخت تنقید کی ہے اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر درست نہیں تھا۔ چونکہ علامہ شبلی ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی وحامی تھے، اس لئے انہوں نے بہ دلائل اس کی تائید کی ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل مباحث بہ تفصیل لکھے گئے ہیں۔

۱۔ قومی جدوجہد کے لئے مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیئے۔ اور کانگریس کی حمایت کرنی چاہیئے۔

۲۔ یہ خیال غلط ہے کہ کانگریس میں شامل ہونے سے مسلمانوں کی شناخت اور ان کا وجود ختم ہو جائے گا۔

۳۔ مسلمانوں کا سیاست سے دور رہنا ان کے لئے مضر ہے، اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان عملاً سیاست میں حصہ لیں۔

۴۔ مسلم لیگ کا نظریۂ سیاست درست نہیں، اس کی اصلاح ہونی چاہیئے اور اسے کانگریس کی طرح عوامی مسائل میں بھی دلچسپی لینی چاہیئے۔

۵۔ حکومت کی نازبرداری نہیں کرنی چاہیئے بلکہ حکومت کو دکھا دینا چاہیئے کہ اسے لوگوں کی

---

[۱۵] حیات شبلی، ص:۵۷۱

[۱۶] مقالات شبلی، ج۸، ص:۱۴۵

جانوں پر اختیار ہے، رایوں پر نہیں۔

علامہ شبلی نے ان نکات پر تفصیل سے بہ دلائل بحث کی اور اس کو قومی جدوجہد اور کامیابی کا راز بتایا۔

بلاشبہ یہ ایک اہم اور وقیع مقالہ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس پر خوب بحث ومباحثہ ہوا، ضلع فیض آباد اور امرتسر میں علامہ شبلی کے خلاف تحریکیں برپا ہوئیں اور ان پر سخت تنقیدیں کی گئیں۔ بعض تنقیدوں کا علامہ شبلی نے جواب بھی دیا۔ لیکن بالآخر مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ شبلی کا ہم خیال نہ ہوسکا اور مسلم لیگ کے سحر میں گرفتار رہا، جس کا نتیجہ اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک کی صورت میں سامنے آیا اور مسلمانوں کی بسی بسائی بستیاں اجڑ گئیں۔ گو علامہ شبلی ان نتائج کو دیکھنے کے لئے زندہ نہ تھے، تاہم اشاروں اشاروں میں انھوں نے جس خدشے کا ذکر کیا تھا وہ بالآخر وقوع پذیر ہوکر رہا۔

علامہ شبلی نے جن نکات پر بحث کی ہے، آج ایک صدی گذر جانے کے بعد ان کی معنویت اور صداقت کھل کر سب کے سامنے آچکی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ برصغیر کے تناظر میں صحیح سیاسی موقف وہی تھا جس کی نشاندہی علامہ شبلی کی سیاسی بصیرت نے ایک صدی قبل کی تھی۔ موجودہ دور میں ممکن ہے کہ بعض امور کی افادیت ثابت نہ ہوسکے، تاہم بحیثیت مجموعی آج بھی قوم پرستوں اور نیشنلسٹ مسلمانوں کے لئے علامہ شبلی کے خیالات دلچسپ اور قابل غور وفکر ہیں۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے "حیات شبلی" میں اس مقالے کا مفصل تعارف کرایا ہے اور اسے "مقالات شبلی" حصہ ہشتم میں شامل کیا ہے۔ اس سلسلے کا آخری مضمون "ہندو مسلمانوں کا اتحاد" کے عنوان سے دو قسطوں میں شائع ہوا۔ پہلا حصہ "مسلم گزٹ" لکھنؤ، میں ۹/اکتوبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں شائع ہوا، جبکہ دوسرا حصہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے پہلے شمارہ جولائی ۱۹۱۶ء میں چھپا۔

اس میں علامہ مرحوم نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا اور اس کے خلاف موقف رکھنے والوں کے دلائل کو مضبوط دلائل سے رد کیا۔ اس کے لیے علامہ مرحوم نے جو دلائل دئے ہیں ان سے ہندوؤں کی صاف طرف داری سامنے آتی ہے، یہی سبب ہے کہ اس کے خلاف احتجاج ہوا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اس احتجاج واختلاف کا بھی جواب لکھا۔ یہ مضمون آج بھی اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ علامہ شبلی کے سیاسی خیالات سے دلچسپی رکھنے والوں کو کم از کم اس کا مطالعہ ایک بار

ضرور کرنا چاہئے۔ راقم نے اس موضوع پر جو مقالہ لکھا ہے اس میں اس مقالے سے بھرپور استفادہ کیا گیا ہے اور وہ بیان شبلی حصہ اول میں شامل ہے۔

۴۔ نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہوجانے سے بچانے کے لیے تمام برادران اسلام کی خدمت میں فریاد:(۱۷) آریوں (آریہ سماجیوں؟) کی مسلسل کوششوں سے ۱۹۰۸ء میں ارتداد کا فتنہ اٹھا اور متعدد مقامات پر نومسلم دوبارہ ہندو ہوگئے۔ اس فتنے کے سدباب کے لئے متعدد علماء میدان میں آئے۔ ان میں غالباً سب سے اہم نام علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ وہ اس واقعے سے تڑپ اٹھے اور اس کے سدباب کے لیے پیہم کوششیں کیں۔ انہوں نے رائے بریلی اور شاہ جہاں پور وغیرہ کا خود دورہ کیا اور راج پوتانہ میں معتمد اشخاص بھیجے۔ آریوں کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لئے ندوہ میں ہندی اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا اور اس سلسلے میں متعدد مضامین لکھے جو مقالات شبلی ہشتم میں شامل ہیں۔

اسی کام کے لئے انھوں نے صیغۂ اشاعت و حفاظت اسلام کے قیام پر زور دیا اور ایک مضمون لکھ کر برادران اسلام کی خدمت میں نومسلموں کو دوبارہ ہندو ہونے سے بچانے کے لئے فریاد کی۔ اس میں انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ حفاظت اسلام کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ جس میں ملک کے تمام صوبوں کے نمائندے ہوں، ایک سکریٹری ہو جو تمام کارروائی پر نظر رکھے، واعظ مقرر کئے جائیں جو دو-دو، چار-چار مہینے ایک- ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلامی تعلیمات اور احکام سکھائیں، مقرروں اور واعظوں کے تیار کرنے کا بھی انتظام کیا جائے، جابجا مکاتب قائم کئے جائیں، جن میں قرآن پاک اور اردو کی تعلیم دی جائے، دیہاتوں میں جو مکاتب قائم ہیں ان میں مسلمان اساتذہ مقرر کرائے جائیں، دینیات کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جو انگریزی خواں طلبہ کے لئے مفید ہو، ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو آریوں سے مناظرہ کرے اور وہ جماعت بھاشا اور سنسکرت سے بھی واقف ہو اور آریوں کے مہمات عقائد کے رد میں رسالے لکھے جائیں، وغیرہ۔

علامہ شبلی نے ان مقاصد کے حصول کے لئے اولاً احباب و معاصرین کو خطوط لکھے، پھر اخبارات ورسائل میں مضامین و مراسلات لکھے جو مقالات کی جلد ہشتم میں شامل ہیں۔ اشاعت اسلام کے سلسلے میں علامہ شبلی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ:

---

(۱۷) مسلم گزٹ لکھنو، ۱۱/ مارچ ۱۹۱۲ء

ہمارے لئے صرف یہی کافی نہیں کہ ہم بے کس بن کر صرف دوسروں کے حملے سے اپنے آپ کو بچائیں۔ اسلام اس لئے آیا تھا کہ تمام دنیا پر اپنے آپ کو پیش کرے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم دوسری قوموں میں اپنے واعظ اور داعی بھیجیں، جو اسلام کی تبلیغ کریں، یہ قطعی ہے کہ اگر صحیح طور سے مذہب اسلام دنیا کی قوموں کے سامنے پیش کیا جائے تو ہزاروں لاکھوں اشخاص نہ صرف ایشیا بلکہ یورپ میں بھی اسلام بے تکلف قبول کر سکتے ہیں۔[۱۸]

۵۔ لیڈروں کا قصور ہے یا لیڈر بنانے والوں کا؟[۱۹]: اس مضمون میں علامہ شبلی نعمانی نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ لیڈر جو چاہتے ہیں کر گزرتے ہیں اور بعض لیڈر بننا نہیں چاہتے پھر بھی انہیں لیڈر بنایا جاتا ہے، اس لئے لیڈروں کا قصور نہیں بلکہ لیڈر بنانے والوں کا قصور ہے۔ علامہ شبلی کا یہ خیال انگریزوں کے دور ظلمت میں تھا، آج کے جمہوری دور میں بھی کم و بیش وہی صورت حال ہے۔

۶۔ نماز جمعہ[۲۰]۔

۷۔ تعطیل جمعہ[۲۱]: تعطیل جمعہ کے متعلق یہ دونوں تحریریں اور وہ عرض داشت جو تعطیل جمعہ کے لیے وایسرائے ہند کی خدمت میں پیش کی گئی تھی شائع کی گئی ہے۔

۸۔ مولانا شبلی بنام مولانا عبدالحی[۲۲]: مولانا سید عبدالحی حسنی نے علامہ شبلی نعمانی پر مولوی عبدالکریم کی معطلی کے سلسلہ میں جو الزامات عائد کیے تھے، علامہ شبلی نے ان کا جواب انہی کے نام ایک مکتوب میں لکھا ہے، جسے مدیر مسلم گزٹ نے شائع کیا۔ یہ مکتوب علامہ شبلی کے کسی مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں ہے۔ البتہ سید صاحب نے اسے مضمون کی صورت میں مقالات شبلی جلد ہشتم میں شائع کیا ہے۔

بہر کیف علامہ شبلی نے نہ صرف "مسلم گزٹ" کے اجرا میں حصہ لیا بلکہ اس کی اشاعت اور فکری آبیاری میں بھی اپنے مضامین اور افکار و خیالات سے اس میں روح پھونکی۔ اللہ تعالی انہیں جزائے خیر دے کہ ان کا ہر قدم ملت کے لیے اٹھتا تھا۔

---

(۱۸) مقالات شبلی، ج۸، ص:۱۰

(۱۹) مسلم گزٹ لکھنو، ۱۸/ مارچ ۱۹۱۲ء

(۲۰) مسلم گزٹ: ۲۶/ مارچ ۱۹۱۳ء، ص:۵

(۲۱) مسلم گزٹ: ۱۶/ اپریل ۱۹۱۳ء، ص:۳

(۲۲) مسلم گزٹ: ۱۱/ جون ۱۹۱۳ء، ص:۵

سفر نامہ ابن بطوطہ: ایک جائزہ

ڈاکٹر ثُمامہ فیصل
اسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ عربی، مانو لکھنؤ کیمپس
sumamaid@gmail.com

عربی زبان میں سفر نامہ نگاری کی روایت باقاعدہ طور پر تیسری صدی ہجری میں شروع ہوئی۔ اِس صنف پر اُس دور کی جو اہم تصنیفات ہم تک پہونچی ہیں ان میں ایک تو " اخبارُ الصِّینِ والہند " ہے جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ سلیمان التاجر کی طرف منسوب ہے جس کا تعلق تیسری صدی ہجری سے تھا جبکہ اس کا دوسرا حصہ، جو اس کے ذیل کی شکل میں ہے، ابوزید السِّیرافي کی طرف منسوب ہے جس کا تعلق چوتھی صدی ہجری سے تھا۔ یہ سفر نامہ ابراہیم الخُوری کی تحقیق کے ساتھ دائرۃ المعارفِ الہندیۃ سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا[۱]۔

تیسری صدی ہجری کا ایک سیاح سَلّام الترجمان بھی کافی مشہور ہے۔ عباسی خلیفہ الواثق باللہ نے ایک خواب دیکھا کہ قرآن میں مذکور یاجوج وماجوج کے قصے میں ذوالقرنین کے ذریعے تعمیر کردہ جس دیوار کا ذکر آیا ہے اس میں ایک شگاف واقع ہو گیا ہے۔ خلیفہ نے سلام الترجمان کی سرپرستی میں ایک ٹیم اس معاملے کی تحقیق وتفتیش کے لئے روانہ کی اور بالآخر سلام الترجمان نے اپنے حالات سفر قلم بند کئے[۲]۔

اسی دور کا ایک اور عرب مصنف جس نے اس صنف پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے وہ ابن خُردَاذبہ (متوفی ۲۸۰ھ) ہے۔ اس کا اصل نام ابو القاسم عبید اللہ بن احمد تھا۔ اس کی تصنیف

---

[۱] ملاحظہ ہو: زکی محمد حسن، الرحالۃ المسلمون فی العصور الوسطی، ص:۲۳؛ ونقولا زیادہ، الجغرافیہ والرحلات عند العرب، ص: ۱۴۹؛ احمد رمضان احمد، الرحلہ والرحالۃ المسلمون، ص:۴۳؛ فؤاد قندیل، أدب الرحلۃ فی التراث العربی، ص: ۷۱- ۷۲، و۹۸۔ اخبار الصین والھند کو دائرۃ المعارف الھندیۃ کے لئے دار الموسم للاعلوم، بیروت، نے شائع کیا۔

[۲] فؤاد قندیل، ادب الرحلۃ فی التراث العربی، ص:۹۱۔

"المسالک و الممالک" کافی مشہور ہے اور اس صنف پر لکھی جانے والی عربی کی ایک اہم تصنیف مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب سب سے پہلے لائڈن یونیورسٹی پریس(Leiden University Press) سے ۱۸۸۹ء میں شائع ہوئی[۳]۔

اسی دور سے تعلق رکھنے والا ایک اور قابل ذکر سفر نامہ ابن فضلان (متوفی ۳۱۰ھ) کا تصنیف کردہ "رسالۃ ابن فضلان فی وَصف الرحلۃ اِلی بِلاد التُّرکِ والخَزرِ والرُّوسِ والصَّقالبۃ" ہے۔ یہ دمشق سے سامی الدہّان کی تحقیق کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ عباسی خلیفہ المقتدر باللہ نے ابن فضلان کو بلغار یہ ایک خاص مشن پر روانہ کیا تھا یہ اسی کی روداد ہے[۴]۔

اس کے علاوہ الیعقوبی (متوفی ۲۹۲ھ) کی "کتاب البلدان"، البَلخی (متوفی ۳۲۲ھ) کی "صُوَرُ الاَقالیم"، قُدامۃ بن جعفر (متوفی ۳۳۷ھ) کی "کتاب الخِراج وصِناعۃ الکتابۃ"، الاِصطَخری (متوفی ۳۴۰ھ) کی "مسالک الممالک"، ابن حَوقَل (متوفی ۳۴۰ھ) کی "المسالک والممالک"، المسعودی (متوفی ۳۴۶ھ) کی "مروج الذّہب ومَعادِنُ الجوہر"، المقدِسی (متوفی ۳۸۰ھ) کی "اَحسنُ التقاسیمِ فی معرفۃ الاَقالیم" اور الادریسی (متوفی ۵۶۰ھ) کی "نُزہۃ المشتاق فی اختِراق الآفاق" وغیرہ اگرچہ بنیادی طور پر جغرافیہ کے موضوع پر تصنیف کردہ اس دور کی مایہ ناز کتابیں ہیں لیکن ہمیں ان میں ضمناً فن سفر نامہ کے خاطر خواہ نمونے بھی نظر آجاتے ہیں۔

ابتدائی دور کے سفر ناموں کے بعد عربی سفر نامہ نگاری میں چار سفر نامے خاص طور سے بہت مشہور ہوئے۔ ایک ابو الریحان البیرونی (متوفی ۴۴۰ھ) کی شہرۂ آفاق تصنیف جو "کتاب الہند" کے نام سے مشہور ہے اور جس کا پورا نام "تحقیقُ ماللہند مِن مَقولۃ مقبولۃ فی العقل اَو مرذُولۃ" ہے۔ البیرونی کو تقابل ادیان اور ہندوستانیات جیسے علمی موضوعات کا بانی مانا جاتا ہے۔ البیرونی نے اس کتاب میں بنیادی طور پر ہندوستانی تہذیب وثقافت، رسم ورواج، عادات واطوار، علوم وفنون، عقائد وعبادات اور مختلف مذاہب پر نہایت عالمانہ اور فلسفیانہ گفتگو کی ہے۔ لہذا یہ کتاب فن سفر نامہ پر

---

[۳] ماخذ سابق، ص:۱۲۵۔

[۴] ماخذ سابق، ص:۱۶۳؛ احمد رمضان احمد، الرحلہ والرحالۃ المسلمون، ص:۴۵؛ نقولا زیادہ، الجغرافیہ والرحلات عند العرب، ص:۱۵۰ و۱۹۵۔

کوئی مستقل کتاب نہیں ہے، البتہ البیرونی نے اپنے مشاہدات اور حالات سفر کو بھی جابجا اس کتاب میں قلم بند کیا ہے [۵]۔

اس سلسلے کا دوسرا قابل ذکر سفر نامہ ابن جُبیر (متوفی ۶۱۴ھ) کا ہے جس کا تعلق اندلس سے تھا۔ دوسرے سفر ناموں کے برعکس اس کا لب و لہجہ سنجیدہ اور ادیبانہ ہے۔ یہ سفر نامہ ابن بطوطہ (متوفی ۷۷۹ھ) کے سفر نامہ سے زیادہ مستند مانا جاتا ہے [۶]۔

ایک اور مشہور عربی سفر نامہ المقدمۃ کے مصنف ابن خَلدُون (متوفی ۸۰۸ھ) کا ہے۔ ابن خلدون کو سماجیات اور تاریخ نویسی کا امام مانا جاتا ہے۔ جس سفر نامہ کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے وہ دراصل تاریخ پر لکھی گئی ان کی وقیع تصنیف "دیوانُ المبتدأ وَالخبر فی تاریخ العرب والبربر" کا ایک حصہ ہے جس کے لئے انہوں نے اپنا معرکۃ الآراء مقدمہ تحریر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے اپنی خود نوشت اور اپنے حالات سفر درج کئے ہیں [۷]۔

اس سلسلے کا چوتھا سفر نامہ ابن بطوطہ کا ہے۔ عربی کے بہت سے نام تو ایسے ہیں جو ہو بہو اور من و عن برصغیر ہند و پاک میں رائج ہیں۔ لیکن بعض ناموں کے تلفظ میں کچھ انحراف بھی واقع ہوا ہے اور ان کو غلط تلفظ کے ساتھ ادا کیا جاتا ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مثال کے طور پر مشہور و معروف کتاب "اَلْفُ لَيْلَةٍ وَلَيْلَةٌ" لیکن ہمارے یہاں ادب سے لے کر پردۂ سیمیں تک اس کو اکثر اَلِفْ لَيْلَہ وَلَيْلَہ کہا جاتا ہے۔ کچھ یہی حال ابن بطوطہ کا بھی ہوا ہے جس کا صحیح تلفظ پہلی ط کے تشدید کے ساتھ یعنی ابن بطُّوطَہ ہے لیکن یہ بغیر تشدید کے ہی زبان زد عام و خاص ہے۔

ابن بطوطہ کا پورا نام ابو عبد اللہ احمد بن عبد اللہ تھا۔ ان کی پیدائش ۷۰۳ ہجری مطابق ۱۳۰۴ عیسوی میں مراکش کے شہر طَنجہَ میں ہوئی تھی۔ یہ وہی شہر ہے جس کو پار کر کے طارق بن زیاد نے اسپین کو فتح کیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابن بطوطہ کے اجداد میں ایک خاتون فاطمہ نام کی تھیں اور انہی کا

---

[۵] فؤاد قندیل، ادب الرحلۃ فی التراث العربی، ص:۲۹۷۔

[۶] ماخذ سابق، ص:۳۸۴؛ نقولا زیادۃ، الجغرافیۃ والرحلات عند العرب، ص:۱۶۷۔

[۷] رحلۃ ابن خلدون، مقدمہ: محمد تاویت الطنجی، ص:۱۹؛ فؤاد قندیل، ادب الرحلۃ فی التراث العربی، ص:۵۲۹۔

نام بعد میں بطوطہ ہو گیا اور انہی کی طرف ابن بطوطہ کی نسبت ہے(۸)۔

ابن بطوطہ ایک علمی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی جائے پیدائش طنجہ بذات خود ایک علمی مرکز تھا اور ایک عالمی شہرت یافتہ بندر گاہ تھا(۹)۔ ابن بطوطہ ایک فقیہ بھی تھے اور ایک ماہر خطیب بھی۔ اسی لئے انہیں کئی بار قاضی کے عہدے پر فائز کیا گیا(۱۰)۔

ابن بطوطہ کو علم حدیث پر بھی کافی دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے اپنے سفر نامے میں ذکر کیا ہے کہ ایشیاء کوچک کے ایک سلطان نے ان سے حدیث پر ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی(۱۱)۔ اس کے علاوہ ابن بطوطہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے ہندوستان کے سلطان محمد بن تغلق کی شان میں ایک قصیدہ عربی میں لکھا ہے جس کے ۷ اشعار انہوں نے اپنے سفر نامہ میں ذکر کئے ہیں(۱۲)۔ ان کے علمی مقام و مرتبے کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ۲۲ سال کی عمر میں انہوں نے فریضۂ حج ادا کرنے کے لئے رخت سفر باندھا تو ان کی جواں سالی کے باوجود قافلے کے لوگوں نے انہیں اپنا قاضی مقرر کر لیا(۱۳)۔

ابن بطوطہ نے اپنی زندگی کے کم و بیش ۳۰ سال سیر و سیاحت اور غریب الوطنی میں گزارے جن میں سے تقریباً ۸ سال سرزمین ہند میں تھے۔ ۱۳۲۵ء میں اس نے اپنے وطن طنجہ کو الوداع کہا اور تقریباً ایک لاکھ بیس ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ ابن بطوطہ کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنا رخت سفر ہمہ وقت تیار رکھتے تھے(۱۴)۔ ابن بطوطہ نے سب سے پہلے فریضۂ حج کی ادائیگی کا ارادہ کیا اور اپنے شہر سے ایک قافلے کے ہمراہ نکل پڑے۔

ابن بطوطہ کے اس سفر نامے کو تین مرحلوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا مرحلہ وہ ہے جس

---

(۸) عبد الہادی التازی، ابن بطوطۃ امیر الرحالۃ، ص: ۱۴۔

(۹) ماخذ سابق، ص: ۱۴۔

(۱۰) ماخذ سابق، ص: ۲۱۔

(۱۱) رحلۃ ابن بطوطۃ، ص: ۱۷۴۔

(۱۲) ماخذ سابق، ص: ۲۹۹۔

(۱۳) ماخذ سابق، ص: ۱۲۔

(۱۴) عبد الہادی التازی، ابن بطوطۃ امیر الرحالۃ، ص: ۱۵؛ نقولا زیادۃ، الجغرافیۃ والرحلات عند العرب، ص: ۱۸۷۔

میں وہ پہلی بار طنجہ سے روانہ ہوئے اور الجزائر، تونس اور لیبیا ہوتے ہوئے مصر پہونچے اور وہیں سے ملک شام ہوتے ہوئے مکہ پہونچے اور اپنا پہلا حج ادا کیا۔ پھر ایران، عراق اور موصل کا سفر کر کے واپس آئے اور دوسری بار حج کیا۔ پھر یمن اور مشرقی افریقہ کا سفر کر کے واپس آئے اور اپنا تیسرا حج ادا کیا۔ پھر رخت سفر باندھا اور اس بار لمبے سفر پر نکل گئے۔ اس سفر کے دوران انہوں نے ہندوستان اور چین کا سفر کیا۔ دوسرے مرحلے میں انہوں نے اندلس کے مختلف شہروں کا اور تیسرے مرحلے میں کچھ افریقی ممالک کا سفر کیا۔

ابن بطوطہ نے اس دور کے معاشی اور سماجی حالات کی بطور خاص اپنے سفر نامے میں تصویر کشی کی ہے۔ انہوں نے آثار قدیمہ اور مساجد و مدارس وغیرہ پر بھی گفتگو کی ہے لیکن اتنا اہتمام نہیں کیا ہے جتنا مختلف قوموں کی تہذیب و ثقافت اور علماء وصوفیا کے احوال و کوائف اور ان کی کرامات کو ذکر کرنے کا کیا ہے، انہوں نے مختلف قوموں کے اقتصادی حالات کو بھی اپنے سفر نامے میں بیان کیا ہے، مثال کے طور پر انہوں نے مختلف علاقوں کے سکوں کا ذکر کیا ہے اور ان کی قیمتوں کا موازنہ بھی کیا ہے[(۱۵)]۔

ابن بطوطہ نے ان نقوش اور کتبوں کا ذکر بھی جابجا کیا ہے جو انھیں قبروں اور مزاروں وغیرہ پر نظر آئے۔ اس سے اس سفر نامے کی تاریخی اہمیت دوبالا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ حَضرموت میں حضرت ہود علیہ السلام کی قبر پر پہنچے تو اس پر یہ لکھا پایا: یہ ہود بن عابر کی قبر ہے[(۱۶)]۔ ملتان میں غیاث الدین تغلق کے مزار پر گئے تو وہاں ان کا یہ قول کندہ پایا: ”میں نے تاتاریوں سے ۲۹ بار جنگ لڑی اور بالآخر ان کو شکست دی، اسی لئے میرا نام الملک الغازی رکھا گیا“[(۱۷)]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سفر نامہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ اس سفر نامے کی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے اسکالرز نے ابن بطوطہ کو ”اعظمُ الرَّحالۃِ المسلمین“ اور ”اعظمُ الرَّحالۃِ العرب“

---

(۱۵) رحلۃ ابن بطوطۃ، ص:۵۳ ؛ عبد الہادی التازی، ابن بطوطۃ امیر الرحالۃ، ص:۲۳۔

(۱۶) رحلۃ ابن بطوطۃ، ص:۵۴ ۔

(۱۷) ماخذ سابق، ص:۲۵۳ ۔

جیسے القاب سے نوازا ہے (۱۸)۔ لیکن کچھ عرب اسکالرز اور کچھ مستشرقین نے اس سفر نامے پر تنقید بھی کی ہے اور اس کی معتبریت پر سوال بھی اٹھائے ہیں۔ مثال کے طور پر ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں اس کے قابل اعتبار ہونے پر شک ظاہر کیا ہے (۱۹)۔ انہوں نے ابن بطوطہ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ بعض جگہوں پر انہوں نے مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے، کچھ من گھڑت قصے بیان کئے ہیں اور کچھ فرضی شخصیات کو بھی ذکر کیا ہے۔ مثال کے طور پر ان کا یہ کہنا کہ سیر اف اور بحرین کے درمیان ایک بندر گاہ کے قریب غوطہ خور ایک دو گھنٹے تک پانی میں رک جایا کرتے تھے حالانکہ کم سے کم اُس دور میں تو یہ چیز بالکل ناممکن تھی (۲۰)۔

اسی طرح انہوں نے کچھ شہروں کے ان مقامات اور ان چیزوں کا ذکر سرے سے نہیں کیا ہے جن کی نسبت سے وہ شہر دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ مثال کے طور پر بغداد کے بیان میں عبد القادر جیلانیؒ کے مزار کا ذکر اور چین کے تذکرے میں چائے کا ذکر مفقود ہے۔ لیکن ایک بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ابن بطوطہ نے خود اپنے سفر نامے میں لکھا ہے کہ دوران سفر ہندوستان میں جب کچھ ڈاکوؤں نے ان کا سامان سفر لوٹ لیا تو اس کے ساتھ ان کے حالات سفر کے مسودات بھی ان کے ہاتھ سے جاتے رہے (۲۱)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے حالات سفر کا ایک خاطر خواہ حصہ اپنے حافظہ سے املا کرایا ہو گا جس میں سہو و نسیان کا قوی امکان تھا۔ تیس سال کے اپنے حالات سفر کو ابن بطوطہ نے فاس کے سلطان ابو عنان المَرینی کی فرمائش پر صرف چند مہینوں کی قلیل مدت میں سلطان کے کاتبِ خاص ابن جُزی کو املا کرایا تھا لہذا بہت ممکن ہے کہ بہت سی باتیں املا کے دوران ان سے فوت ہو گئی ہوں (۲۲)۔

---

(۱۸) زکی محمد حسن، الرحالة المسلمون فی العصور الوسطی، ص:۱۳۶۔

(۱۹) مقدمة ابن خلدون، ص:۲۲۷۔

(۲۰) رحلة ابن بطوطة، ص:۱۶۲؛ عبد الهادی التازی، ابن بطوطة امیر الرحالة، ص:۲۷۔

(۲۱) رحلة ابن بطوطة، ص:۲۱۴۔

(۲۲) نقولا زیادة، الجغرافیة والرحلات عند العرب، ص:۱۸۹۔

بہر حال ان تمام اعتراضات کے باوجود سفر نامہ ابن بطوط کی اہمیت کا اعتراف نہ صرف یہ کہ عرب اسکالرز نے کیا ہے بلکہ بہت سے مستشرقین نے بھی اس کی تعریف کی ہے۔ انہوں نے اپنی زبانوں میں اس کا ترجمہ کیا ہے اور اس پر تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ سفر نامہ ابن بطوطہ کا دنیا کی تقریباً سبھی مشہور زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے جن میں Hamilton Gibb کا انگریزی ترجمہ، José de Santo-Antonio Moura کا پرتگالی ترجمہ اور Charles Defrémery اور Beniamino Raffaello Sanguinetti کا فرانسیسی ترجمہ خاص طور سے قابل ذکر ہے[۲۳]۔

اردو زبان میں بھی اس سفر نامہ کے کئی ترجمے سامنے آچکے ہیں جن میں ایک قدیم ترجمہ مولانا عطاء الرحمن کا ہے جو رحمانی پریس دہلی سے ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا، جبکہ دوسرا ترجمہ رئیس احمد جعفری کا ہے جو ادارہ درس اسلام دیوبند سے شائع ہوا اور کافی مقبول ہوا۔ اس کے سرورق پر یہ جملہ لکھا ہے: ''یہ عظیم سفر نامہ اِس سیاح کی آپ بیتی ہی نہیں ہے، روداد جہاں ہے''۔ اب اس سفر نامے کے کچھ اقتباسات پر نظر ڈال لیتے ہیں۔ یہ اقتباسات رئیس احمد جعفری کے اردو ترجمے سے اخذ کئے گئے ہیں۔

شہر بغداد کے تذکرے میں امام ابو حنیفہ کے مزار کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ رصافہ کے قریب امام ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، اس پر ایک بہت بڑا قبہ بنا ہوا ہے، اور زاویہ بھی ہے، اس میں ہر وارد و صادر کو کھانا ملتا ہے۔ شہر بغداد میں سوا اس خانقاہ کے آج کوئی ایسی خانقاہ نہیں ہے جس میں کھانا کھلایا جاتا ہو۔ اللہ برتر کی ذات پاک ہے، جو اشیا کو پیدا کرتی ہے اور پھر انہیں بدل دیتی ہے۔ اسی کے قریب امام ابو عبد اللہ احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کا مزار ہے، اس پر کوئی قبہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ آپ کے مزار پر کئی مرتبہ قبہ بنایا گیا، لیکن ہر مرتبہ خدا کی قدرت سے منہدم ہو گیا۔ باشندگان بغداد آپ کے مزار کی بہت تعریف کرتے ہیں، اور اکثر آپ ہی کے مذہب پر ہیں[۲۴]۔

---

[۲۳] ماخذ سابق، ص: ۴۰ و ۴۲

[۲۴] سفر نامہ ابن بطوطہ، حصہ اول، ص: ۲۴۷۔

ترکوں کے ملک سے متعلق لکھتے ہیں: اب ہم ترکوں کے ملک کی طرف روانہ ہوئے جو بلادروم کے نام سے معروف ہے۔ اسے روم اس لئے کہتے ہیں کہ زمانہ قدیم میں یہ سرزمین رومیوں اور یونانیوں کے مذاہب اور ثقافت کا سب سے بڑا مرکز تھی۔ یہاں اب بھی بہت سے عیسائی ذمی کی حیثیت سے رہتے ہیں ۔دس دن سفر کرنے کے بعد ہم شہر علایا میں پہنچے، یہ بلادروم کا پہلا شہر ہے، اور اقالیم دنیا میں سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔ دیگر بلاد میں جو متفرق محاسن ہیں، اللہ برتر نے وہ کل محاسن اس میں جمع کر دئے ہیں ۔ اس کے باشندے بے انتہا خوب صورت ہیں، کپڑے نہایت پاکیزہ پہنتے ہیں، اور کھانا نہایت اچھا کھاتے ہیں، اور تمام خلق اللہ میں سب سے زیادہ بااخلاق ہیں، اسی لئے یہ کہا جاتا ہے: ''البرکۃ فی الشام والشفقۃ فی الروم ''یعنی برکت شام میں ہے، اور شفقت [رحمدلی] روم میں (۲۵)۔

دہلی کے سلطان غیاث الدین بلبن کے بارے میں اپنے تاثرات یوں پیش کئے ہیں: بلبن اپنے آقا کو قتل کر کے خود بادشاہ بن بیٹھا اور بیس برس تک سلطنت کرتا رہا۔ اس سے پہلے بیس برس تک بطور نائب کے بھی کل امور سلطنت اس کے ہاتھ میں تھے۔ یہ بادشاہ منصف مزاج، بردبار، نہایت نیک چلن تھا اور عالم فاضل تھا۔ اس نے ایک مکان بنوایا تھا۔ اس کا نام دار الامن رکھا تھا۔ جو مقروض اس میں داخل ہو جاتا بادشاہ اس کا قرضہ ادا کر دیتا تھا۔ کوئی قاتل یا مجرم اس میں داخل ہو جاتا تو مقتول یا مظلوم کے وارثوں کو خون بہا دے کر راضی کر دیتا تھا۔ اس کی قبر بھی اس کے مکان میں بنائی گئی ہے۔ میں نے یہ قبر دیکھی ہے (۲۶)۔

پان کے متعلق ابن بطوطہ لکھتے ہیں: پان بھی اس طرح لگایا جاتا ہے جس طرح انگور کی بیل لگائی جاتی ہے... پان کے درخت میں کوئی پھل نہیں ہوتا، مقصود اس کے پتے ہوتے ہیں۔ ان میں سے عمدہ زرد ہوتا ہے، اس کے پتے روزانہ چن لئے جاتے ہیں۔ باشندگان ہند پان کی بہت

---

(۲۵) ماخذ سابق، ص: ۲۹۵۔

(۲۶) سفر نامہ ابن بطوطہ، حصہ دوم ص: ۵۴۔

عزت کرتے ہیں۔ جب کوئی شخص کسی کے گھر پر اس سے ملنے جاتا ہے تو وہ اسے پانچ پان دیتا ہے، گویا اس نے دنیاومافیہاسب کچھ دیدیا، بالخصوص اگر وہ کوئی امیر یابڑا ہے۔ ان کے نزدیک پان کا دینا بہت بڑی بات سمجھی جاتی ہے، اور اس کا یہ فعل چاندی اور سونے کے دینے سے بھی زیادہ اس کی سخاوت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ چھالیا لیتے ہیں، اسے توڑتے ہیں، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے ہیں ۔ آدمی اسے اپنے منہ میں ڈال لیتا ہے اور چباتا ہے پھر پان لیتا ہے، اور اس پر تھوڑا سا چونا لگا کر چھالیوں کے ساتھ چباتا ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ منہ خوشبودار بناتا ہے، بدبو دور کرتا ہے، کھانا ہضم کرتا ہے[۲۷]۔

مآخذ

۱. عبد الہادی التازی، ابن بطوطہ امیر الرحالۃ، الدار المصریۃ اللبنانیۃ، قاہرہ، ۲۰۰۲ء۔

۲. فؤاد قندیل، ادب الرحلۃ فی التراث العربی، مکتبۃ الدار العلمیۃ للکتاب، قاہرہ، ۲۰۰۲ء۔

۳. سلیمان التاجر وابوزید السیرافی، اخبارُ الصِّینِ وَالہِند، دائرۃ المعارف الہندیۃ۔

۴. نقولا زیادۃ، الجغرافیۃ والرحلات عند العرب، الشرکۃ العالمیۃ للکتاب، بیروت، ۱۹۸۷ء۔

۵. ابن خلدون، دیوانُ المبتدأ وَالخبر فی تاریخ العرب والبربر، دار الفکر، بیروت، ۲۰۰۱ء۔

۶. زکی محمد حسن، الرحالۃ المسلمون فی العصور الوسطی، دار الرائد العربی، بیروت، ۱۹۸۱ء۔

۷. احمد رمضان احمد، الرحلۃ والرحالۃ المسلمون، دار البیان العربی، جدہ، ب۔ت۔

۸. رحلۃ ابن خلدون، تحقیق: محمد تاویت الطنجی، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۲۰۰۴ء۔

۹. رحلۃ ابن بطوطۃ، دار صادر، بیروت، ۲۰۰۹ء۔

۱۰. رسالۃ ابن فضلان فی وَصف الرحلۃ اِلی بِلاد التُّرکِ والخَزرِ والرُّوسِ والصَّقالبۃ، المجمع العلمی العربی، دمشق، ب۔ت۔

۱۱. سفر نامہ ابن بطوطہ، رئیس احمد جعفری، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۶ء۔

۱۲. ابن خرداذبہ، المسالک والممالک، بریل، لائڈن، ۱۸۸۹ء۔

---

(۲۷) ماخذ سابق، ص: ۲۷۹۔

شیر شاہ سوری: ارض بنگالہ کا عظیم معمار

ڈاکٹر کمال اشرف

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ دینیات، عالیہ یونیورسٹی، کولکاتا، مغربی بنگال

kamalashraf9834@gmail.com

فرید خان، ملقب بہ ”شیر شاہ سوری“، ولد حسن خان، کی پیدائش سہسرام (بہار) میں ہوئی۔ فرید خان کا تاریخِ عالم کی اُن ممتاز شخصیات میں شمار ہوتا ہے جو نہ صرف ایک عظیم سپہ سالار بلکہ ایک اعلیٰ پایہ حکمران بھی تھے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ان کا مقام نہایت بلند ہے۔ اس نے اپنی پوری زندگی ہندوستان کی تعمیر وترقی کے لیے وقف کر دی۔

شیر شاہ سوری نے اگرچہ محض پانچ برس (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) ہندوستان پر حکومت کی، تاہم اس قلیل عرصے میں اس نے ایسے غیر معمولی اور دیرپا کارنامے انجام دیے جو آنے والی صدیوں کے لئے ایک مثالی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس کی انتظامی بصیرت اور اصلاحات نے نہ صرف مغل حکمرانوں کو متأثر کیا بلکہ بعد ازاں انگریز بھی اس کے بعض انتظامی اصولوں کو اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔

شیر شاہ سوری کے آباء واجداد کا تعلق افغان قبیلہ ”سور“ سے تھا۔ جب دہلی میں لودھی خاندان—جو نسلاً افغان تھا—برسرِ اقتدار آیا تو افغانستان کے مختلف علاقوں سے متعدد سردار ہندوستان کی جانب متوجہ ہوئے۔ انہی سرداروں میں شیر شاہ سوری کے دادا ابراہیم خان سوری بھی شامل تھے۔ ان کے والد حسن خان کو سلطان سکندر لودھی نے سہسرام کی جاگیر عطا کی تھی۔ شیر شاہ اپنے والد کے آٹھویں فرزند تھے۔

فرید خان کا رجحان بچپن ہی سے حکمرانی اور نظم ونسق کی جانب تھا۔ جب اس نے اقتدار حاصل کیا تو ”شیر شاہ“ کا لقب اختیار کیا اور یوں سوری سلطنت کی بنیاد رکھی۔ ڈاکٹر حسن آرزو لکھتے ہیں:

> جب دہلی کی سلطنت لودھی خاندان کے پہلے حکمراں، فیاض صفت سلطان بہلول لودھی کے

قبضے میں آئی تو ان کے ہم وطن افغان، ملکِ روہ[۱] سے بڑی تعداد میں ہندوستان آنے لگے۔ یہ ایک فطری عمل تھا کہ وہ ہر سال، ہر مہینے بلکہ ہر روز ہندوستان آتے تھے اور اپنی ضروریات سے زیادہ جاگیریں حاصل کرتے تھے۔ انہی سلطان بہلول کے عہد میں ابراہیم خان سوری (شیر شاہ سوری کے دادا)، جو ملکِ روہ کے 'سرگری' نامی مقام کے رہنے والے تھے، اپنے دوسرے افرادِ قوم کے ساتھ ہندوستان آئے۔[۲]

شیر شاہ سوری سے بابر کو تشویش: شیر شاہ سوری کا شمار اُن حکمرانوں میں ہوتا ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ہندوستان پر محض پانچ برس حکومت کی، اور ان کی وفات کے دس برس کے اندر اندر ان کے خاندان کی حکمرانی بھی ختم ہو گئی۔ اگرچہ شیر شاہ کی حکومت کا دورانیہ مختصر تھا، تاہم نظمِ حکومت کی درستگی، انتظامی صلاحیت، محنت، انصاف پسندی، ذاتی کردار کی دیانت، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنے کا جذبہ، نظم وضبط اور حکمتِ عملی وضع کرنے میں وہ کسی طور اکبر سے کم نہ تھے۔

شیر شاہ سوری نے ابتدا میں مغل فوج میں خدمات انجام دیں۔ وہ ۱۵۲۸ء میں چندری کی مہم کے دوران بابر کے ہمراہ تھے۔ مغل فوج میں رہتے ہوئے ہی انہوں نے ہندوستان کے تخت پر متمکن ہونے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ شیر شاہ بابر کے ساتھ کھانا تناول کر رہے تھے۔ ان کے کھانے کے انداز کو دیکھ کر بابر نے اپنے وزیر سے کہا کہ اس شخص کے طرزِ عمل پر نظر رکھو؛ میں اس کی پیشانی پر سلطنت کی لکیریں دیکھ رہا ہوں، لہٰذا اس کے بارے میں ہوشیار رہنا اور اگر ممکن ہو تو اسے اپنی تحویل میں لے لینا۔ خلیفہ نے شہنشاہ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ شیر شاہ میں وہ صلاحیت نہیں جو بابر اس کے بارے میں محسوس کر رہے ہیں۔ عباس سروانی اس واقعے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> چند دنوں کے بعد خاصے کے وقت پادشاہ کی مجلس میں شیر خان حاضر ہوا۔ اس کے سامنے بھی قاب بھری ہوئی آشِ ماہیچہ رکھی گئی۔ وہ اس کے کھانے کا طریقہ نہ جانتا تھا، مگر شیر خان نے اسے چھری سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے چمچے سے بآسانی کھالیا۔ ظلِ سبحانی، بابر پادشاہ، شیر خان کی عقل وفراست کو دیکھ کر متعجب ہوئے اور خلیفہ، جو اس کا وزیر تھا، سے کہا کہ شیر خان کے احوال

---

[۱] ملک روہ: مشرقی افغانستان اور موجودہ شمالی مغربی پاکستان کے پہاڑی علاقے۔

[۲] ڈاکٹر حسن آرزو، سلطان شیر شاہ سوری: احوال وآثار، دانش کدہ، دریاپور، پٹنہ، ۱۹۸۱ء، ص: ۱۳۔

سے غافل نہ رہنا چاہیے، کیونکہ وہ صاحبِ تدبر ہے اور اس کے چہرے سے آثارِ پادشاہت نمایاں ہیں۔ میں نے اس سے بڑے بڑے پٹھان سردار دیکھے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کے بارے میں کبھی میرے دل میں خطرہ پیدا نہیں ہوا؛ اس شخص کو دیکھتے ہی میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اسے گرفتار کرنا چاہیے، کیونکہ اس میں بزرگی و ریاست کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس موقع پر خلیفہ نے عرض کیا کہ شیر خان بے قصور ہے اور اس قدر جمعیت نہیں رکھتا کہ اس سے کسی قسم کا اندیشہ دل میں پیدا ہو۔ اگر قبلۂ عالم شیر خان کو گرفتار کریں گے تو جتنے پٹھان رکابِ سعادت میں ہیں، سب کے دلوں میں خوف پیدا ہو جائے گا، اور کسی افغان کو ہمارے عہد و پیمان پر اعتماد نہ رہے گا، جو تفرقے کا سبب بنے گا۔ یہ سن کر پادشاہ اس معاملے میں خاموش ہو گئے۔ (۳)

فرار کے بعد شیر شاہ نے اپنی صفائی میں بادشاہ کو ایک خط بھی تحریر کیا۔ تاریخِ شیر شاہی (ص ۴۳) میں اس واقعے کی تفصیل یوں مذکور ہے:

شیر خان نے فراست سے دریافت کیا کہ پادشاہ میرے حق میں کیا فرماتا ہے۔ پھر اپنے ڈیرے (آرام گاہ) میں آکر لوگوں سے کہا کہ آج پادشاہ نے میری طرف بہت غور سے دیکھا اور وزیر سے کچھ کہا، بلکہ نظرِ عبرت سے دیکھا۔ اب میرا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ میں یہاں سے جاتا ہوں۔ چنانچہ وہ اسی وقت سوار ہو کر لشکر سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد پادشاہ نے دیکھا کہ شیر خان مجلس میں موجود نہیں۔ اسے یاد فرمایا۔ لوگ جب اس کے مکان پر گئے تو وہ وہاں نہ تھا۔ پادشاہ نے خلیفہ سے فرمایا: اگر تم مجھے منع نہ کرتے تو میں اسے اسی وقت پکڑ لیتا۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ بننے والا ہے، اور آگے خدا کو علم ہے۔ (۴)

ودیابھاسکر بنگال میں شیر شاہ سوری کے بطورِ حکمراں آنے کا ذکر اس انداز میں کرتے ہیں:

بنگال کے حکمراں نصرت شاہ کی وفات کے بعد وہاں کے امیروں نے سلطان محمود کو اُن کا جانشین مقرر کیا، لیکن محمود نہایت نااہل اور بزدل ثابت ہوا، جس کے نتیجے میں جلد ہی بنگال میں بدامنی پھیل گئی۔ شیر خاں نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا۔ اُس نے فتح ملکہ سے تین سو من سونا حاصل کیا اور اس کی مدد سے کثیر تعداد میں فوج جمع کی۔ اس سونے کے عوض اُس نے فتح ملکہ کو دو پرگنے اور کچھ نقد رقم ادا کی۔ اس طرح فوج منظم کر کے اُس نے بنگال کی طرف پیش قدمی کی اور سیکری گلی، یعنی گڑھی کے اُس پار تک بنگال کے تمام علاقوں پر اپنا تسلط قائم

---

(۳) عباس خان سروانی، تاریخ شیر شاہی، سلمان اکیڈمی، حق نشان ہاؤسنگ سوسائٹی، کراچی، ص: ۴۲- ۴۳۔

(۴) ماخذ سابق۔

کر لیا۔[۵]

بنگال کا نیا نظامِ حکومت: شیر شاہ نے سب سے پہلے داخلی اور مالی اصلاحات پر توجہ دی۔ اُس نے اپنی وسیع و عریض سلطنت کو ۴۷ حصوں میں تقسیم کیا۔ اُس کے عہدِ حکومت میں ایک لاکھ سولہ ہزار پر گنے تھے۔ شیر شاہ سے قبل انتظامی اکائیاں شق، سرکار اور پرگنہ کہلاتی تھیں، جب کہ ''صوبہ'' مغلوں کی دی ہوئی اصطلاح ہے۔ شیر شاہ کے زمانے میں ''سرکار'' کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ بعد میں مغلوں نے جب سلطنت کو صوبوں میں تقسیم کیا تو ''سرکار'' کو ضلع کی حیثیت دے دی گئی، اور ضلع کی یہی انتظامی اہمیت آج تک برقرار ہے۔

کالکارنجن قانون گو لکھتے ہیں:

> شیر شاہ کو اپنی زندگی میں شاہی دارالسلطنت آگرہ اور دہلی میں کبھی چار ماہ سے زیادہ قیام کا موقع نہیں ملا۔ لہٰذا یہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے کہ اسی مختصر وقفے میں اُس نے نظامِ حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا ہوگا اور مالی اصلاحات پر عمل درآمد کیا ہوگا۔ علاوہ ازیں سڑکوں کی تعمیر کا کام بھی اسی دور میں ہوا۔ شاہراہِ عام کی حفاظت کے لیے جگہ جگہ پولیس مقرر کی گئی اور اشیائے درآمد پر ٹیکس عائد کیا گیا۔ اس دور میں شیر شاہ کے کارناموں کا درج ذیل خاکہ پیش کیا جاتا ہے، جو بڑی حد تک مستند سمجھا جاتا ہے اور اس پر عمومی اتفاق پایا جاتا ہے۔[۶]

شیر شاہ نے بنگال کے اندرونی علاقوں کا تیز رفتار دورہ کیا۔ اس کا ثبوت ''شیر پور'' اور ''شیر گڑھ'' جیسے مقامات ہیں، جو اُس نے آباد کیے۔ کہا جاتا ہے کہ اُسے اپنے نام سے مقامات منسوب کرنے کا شوق تھا۔

۱. بنگال میں زمین کی باقاعدہ پیمائش کا آغاز کیا گیا۔
۲. اصلاحات نافذ کرتے وقت اُس نے دوراندیشی اور مصلحت سے کام لیا۔ قدیم شرائط کے مطابق زمینداروں کی جاگیریں اُن کے پاس برقرار رہنے دیں اور اُن میں کوئی مداخلت نہیں کی۔
۳. بنگال میں متعدد نئے زمیندار مقرر کیے، جس کے نتیجے میں بنگال پٹھانوں کا دوسرا وطن بن گیا۔ اُس نے شمالی ہند سے راجپوت زمینداروں کو بھی لاکر آباد کیا۔

---

[۵] ودیا بھاسکر، شیر شاہ سوری، نیشنل بک ٹرسٹ، نئی دہلی، ۱۹۹۰، ص:۳۶۔

[۶] کالکارنجن قانون گو، شیر شاہ اور اس کا عہد، مترجم: رام آشرے شرما، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۱، ص ۴۹۵۔

۴. ایک مضبوط بحری بیڑے کی بنیاد رکھی۔

۵. سڑکوں کی تعمیر کرائی۔

۶. فوجی حکومت کی جگہ سول حکومت قائم کی۔

شیر شاہ کے عہد میں بنگال کی حدودِ اربعہ کے تعین کے لیے ہمارے پاس قطعی ذرائع موجود نہیں ہیں۔ البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اُس کے زمانے سے لے کر ابوالفضل اور راجا ٹوڈر مل کے دور تک اس صوبے کی مغربی سرحد میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں آئی۔ مغربی سرحد دریائے کوسی کے کنارے تک مانی جاتی تھی، جہاں اُس کا سنگم دریائے گنگا سے ہوتا ہے۔ وہاں سے یہ حد گنگا کو پار کر کے گھڑی کے مغربی دہانے سے جنوب کی طرف مڑتی، راج محل کی پہاڑیوں اور جھارکھنڈ کے جنگلات کے درمیان سے گزرتی ہوئی بیر بھوم اور شکھر بھوم تک پھیل جاتی تھی۔(۷)

شیر شاہ سوری کی انصاف پسندی: شیر شاہ سوری کی عدل گستری کے بارے میں تاریخی مصادر میں متعدد واقعات مذکور ہیں۔ عہد نامۂ شیر شاہ سوری میں ان کی عدل پسندی کا ایک ایسا واقعہ بیان ہوا ہے جس نے پورے ملک میں رعایا کو انصاف کے استحکام کا یقین دلایا۔ اس واقعے کا ذکر انگریز مؤرخ ایلفنسٹن (Elphinstone) نے بھی کیا ہے۔

روایت کے مطابق ایک مرتبہ سلطان شیر شاہ سوری کا بیٹا محمد عادل شاہ ہاتھی پر سوار ہو کر آگرہ کی گلیوں میں گشت کر رہا تھا۔ دورانِ گشت اس کی نظر ایک حسین خاتون پر پڑی جو اپنے غسل خانے میں نہا رہی تھی۔ شہزادہ اس منظر سے اس قدر متأثر ہوا کہ اس نے ہاتھی وہیں رکوا دیا اور بے باکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے پان کا بیڑا اٹھا کر اس خاتون کی طرف پھینک دیا۔ وہ خاتون ایک مہاجن کی بیوی اور نہایت باحیا عورت تھی۔ اس ناپسندیدہ حرکت سے دل برداشتہ ہو کر اس نے خودکشی کا ارادہ کیا، تاہم اس کے شوہر نے اسے باز رکھا۔ بعد ازاں مہاجن اپنی بیوی کے ساتھ پیش آنے والے اس واقعے کی شکایت لے کر سلطان شیر شاہ سوری کی عدالت میں حاضر ہوا۔ دربار منعقد تھا۔ مہاجن نے بھرے دربار میں شہزادے کے طرزِ عمل کی تفصیل بیان کی۔ یہ واقعہ سن کر شیر شاہ سوری شدید غضبناک ہوئے اور فوراً حکم صادر کیا کہ مہاجن کو ہاتھی پر سوار کر کے محمد عادل شاہ کے محل لے جایا جائے، اور شہزادے کی اہلیہ (شیر شاہ کی بہو) کو اسی طرح اس کے سامنے لایا جائے، اور

---

(۷) ماخذ سابق، ص: ۱۹۵ - ۱۹۶۔

مہاجن اس کی طرف بھی پان کا بیڑا پھینکے۔ یہ حکم سن کر دربار لرز اٹھا۔ امراء اور درباریوں نے شہزادے اور شاہی خاندان کی ناموس کے پیشِ نظر سفارشیں کیں، مگر شیر شاہ سوری اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ وہ انصاف کے معاملے میں کسی قسم کی رعایت کے قائل نہ تھے۔ تاہم جب مہاجن نے سلطان کے غیر معمولی عدل پر مبنی فیصلے کو سنا تو وہ شیر شاہ سوری کے قدموں میں گر پڑا اور اپنی شکایت واپس لے لی۔ اس واقعے کے بعد پورے ملک میں یہ تأثر عام ہو گیا کہ سلطان کی حکومت میں کوئی بھی طاقت ور شخص کسی کمزور پر ظلم کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

سلطان شیر شاہ سوری کی مذہبی رواداری: شیر شاہ سوری مذہبی معاملات میں نہایت روادار اور غیر جانب دار حکمراں تھا۔ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرتا تھا اور ریاستی و حکومتی امور میں عملی طور پر مذہبی غیر جانبداری کی پالیسی پر کاربند رہتا تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اس نے کشمیر کے شیعہ چک حکمرانوں کی حکومت کے استحکام کے لیے اپنے افغان جرنیلوں اور فوجی دستوں کو وہاں روانہ کیا۔ وہ ہندوؤں اور دیگر مذاہب و مسالک کے پیروکاروں کا احترام کرتا تھا اور اپنی تمام رعایا کی فلاح و بہبود کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتا تھا۔ اگر صاحبِ استطاعت ہندوؤں سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا تو اسی طرح صاحبِ نصاب مسلمانوں سے زکوٰۃ بھی لی جاتی تھی، اور ریاست ان سب کی جان، مال اور عزت و آبرو کی ضامن ہوتی تھی۔ ریاستی نظم و نسق میں مذہبی امتیاز کو کوئی دخل حاصل نہ تھا۔ شیر شاہ کے عہد میں ایک افغان اور ایک ہندو بنیے کو یکساں مواقع میسر تھے کہ وہ اپنی صلاحیت کی بنیاد پر ترقی کر کے حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب تک پہنچ سکیں۔

اسی طرح اس کی سلطنت میں بلا لحاظِ مذہب، ملت اور طبقہ، غریبوں، کمزوروں، بیواؤں، اندھوں اور دیگر محتاج افراد کو وظائف دیے جاتے تھے۔ حکومت کی جانب سے بے گھر افراد کے لیے مکانات تعمیر کیے گئے اور ناداروں کو مفت خوراک فراہم کی جاتی تھی۔ شیر شاہی حکومت اپنی رعایا کو روٹی اور مکان جیسی بنیادی سہولتیں فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری سمجھتی تھی، اور اس ضمن میں کسی قسم کی مذہبی تفریق روا نہیں رکھی جاتی تھی۔ اس طرح شیر شاہ سوری کے دور میں حکومتی معاملات میں غیر جانب داری اور رواداری کا رجحان بتدریج مضبوط ہوتا چلا گیا۔[۸]

اکبر اعظم اور شیر شاہ کی مذہبی رواداری میں بنیادی فرق: شیر شاہ سوری کے نزدیک حکومت کی

(۸) ڈاکٹر حسن آرزو، سلطان شیر شاہ سوری: احوال و آثار، ص: ۱۰ - ۱۱۔

بنیاد عدل و انصاف پر قائم ہونی چاہیے، اور اس کا واضح اصول یہ تھا کہ انصاف کے معاملے میں کفر واسلام، امیر و غریب، حاکم و محکوم، بلکہ اپنے عزیز و اقارب میں کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔ وہ انصاف کرتے وقت نہ بڑوں کو رعایت دیتا تھا اور نہ ہی اپنے بیٹوں، رشتہ داروں یا امراء کو قانون سے بالاتر سمجھتا تھا۔ اسی غیر جانبدارانہ عدل کی وجہ سے اس کا شمار ان حکمرانوں میں ہوتا ہے جن کا انصاف تاریخ کا حصہ بن چکا ہے، بالکل اسی طرح جیسے مغل بادشاہ جہانگیر کا عدل تاریخ میں مشہور ہے۔

مؤرخ اے-ایل- سری واستو لکھتے ہیں کہ شیر شاہ اور سوری سلاطین کی مذہبی رواداری سے سبق حاصل کرتے ہوئے اکبر اعظم نے بھی اسے متحدہ ہندوستان کے لیے ناگزیر سمجھا۔ شیر شاہ اور اکبر کی مذہبی پالیسیوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے وہ ایک اہم فرق کی نشاندہی کرتے ہیں:

> اکبر نے اپنی ہندو رعایا کو خوش کرنے کی جلدی میں اپنی مسلم رعایا کے جذبات کا پورا خیال نہیں رکھا۔ اس کا عملی نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلہ مزید بڑھ گیا اور دونوں کے باہمی اتحاد میں ردِّ عمل کی ایک دیوار حائل ہو گئی۔ اس کے برعکس، شیر شاہ کی پالیسی یہ تھی کہ کسی مذہب کو دوسرے مذہب کے مقابلے میں کمتر نہ سمجھا جائے اور نہ ہی اسے حقیر ثابت کیا جائے۔ چنانچہ اس عہد میں اس کی مذہبی پالیسی زیادہ متوازن، مؤثر اور درست ثابت ہوئی۔[9]

سری واستو کے مطابق شیر شاہ کی غیر جانبدارانہ مذہبی پالیسی کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ کھلے طور پر ہندو رعایا کی حمایت اور ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب رہا، اور اسے مسلمانوں کی جانب سے بھی کسی قسم کی ناراضی یا شکایت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس کے خیال میں اگر اکبر اور اس کے جانشین، شیر شاہ سوری کی مذہبی غیر جانبداری اور عدل پر مبنی پالیسی کو اپناتے تو ہندوستان میں آج موجود مذہبی تعصبات اور پیچیدہ سماجی مسائل کی اصلاح بہت پہلے ممکن ہو جاتی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ جہاں اکبر کی مذہبی رواداری بعض اوقات سیاسی مصلحت اور توازن کے فقدان کا شکار نظر آتی ہے، وہیں شیر شاہ سوری کی رواداری مکمل طور پر عدل، مساوات اور غیر جانب داری پر مبنی تھی، جو ایک متعدد مذہبی معاشرے کے لیے زیادہ مؤثر اور پائیدار ثابت ہوئی۔

اندازِ حکمرانی اور انتظامی صلاحیتیں: شیر شاہ سوری کی شخصیت کا درخشاں پہلو اس کی غیر معمولی انتظامی صلاحیتیں تھیں، جن کی اہمیت اس کی جنگی مہمات سے کہیں زیادہ تھی۔ اگرچہ اس سے قبل

---

(۹) Ashirbadi Lal, Srivastava, *Sher Shah and His Successor*, Royal Fine Art Press, Agra, 1950, p. 13.

علاء الدین خلجی، محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق جیسے حکمرانوں نے نظم و نسق کے میدان میں بعض اصلاحات نافذ کی تھیں، تاہم شیر شاہ سوری نے نہایت قلیل مدت میں جو ہمہ گیر اور دیرپا انتظامی نقوش قائم کیے، وہ اپنی مثال آپ ہیں۔

شیر شاہ نے اپنا پورا عہد بہتر نظم و نسق، مستحکم ریاستی ڈھانچے اور منظم فوجی تنظیم کے قیام کے لیے وقف کر دیا۔ وہ شاہانہ جاہ و جلال اور عیش و عشرت کا قائل نہ تھا اور اس قسم کی محفلوں سے اجتناب برتتا تھا۔ اس کی توجہ کا مرکز ہمیشہ ریاستی استحکام، عدل کا قیام اور رعایا کی فلاح و بہبود رہا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ شیر شاہ سوری نے آسام سے لے کر بنگال، بہار، ملتان اور سندھ تک، اور کشمیر سے سدپارہ کی پہاڑیوں تک اپنی حکومت قائم کی اور اس پورے وسیع خطے میں ایک یکساں اور مربوط نظامِ حکومت نافذ کیا۔ اس نے سلطنت کو سرکاروں اور پرگنوں میں تقسیم کیا، جو موجودہ دور کے کمشنری ڈویژنز اور اضلاع سے مشابہ ہیں۔ شیر شاہ حکومتوں کے زوال کی بنیادی وجہ عدل کی کمی کو قرار دیتا تھا، اسی لیے جہاں بھی اسے اقتدار یا اختیار ملا، اس نے نظامِ عدل کے قیام کو اپنی اولین ترجیح بنایا اور ہر اہم شہر میں عدالتیں قائم کیں۔

شیر شاہ سوری کے انتظامی کارناموں میں شاہراہوں کی تعمیر کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس نے بنگال سے لے کر افغانستان تک ایک عظیم الشان شاہراہ تعمیر کروائی، جو بعد میں گرینڈ ٹرنک روڈ (G.T. Road) کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ ایک سڑک آگرہ سے برہانپور، دوسری آگرہ سے جودھ پور اور چتوڑ تک، اور تیسری لاہور سے ملتان تک تعمیر کروائی۔ ان شاہراہوں کے کنارے تقریباً سترہ سو کاروان سرائیں قائم کی گئیں، جہاں ہندوؤں، مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے لیے قیام و طعام کے علیٰحدہ اور مناسب انتظامات کیے گئے تھے۔

ڈاکٹر حسن آرزو لکھتے ہیں:

> شیر شاہ کا شمار ہندوستان کے جلیل القدر اور عظیم فرماں رواؤں میں ہوتا ہے، جن کی زندگی سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے۔ وہ ایک معمولی سپاہی اور سہسرام کے ایک چھوٹے سے جاگیردار کا بیٹا تھا، جس نے محض اپنے عزائم، یقینِ محکم اور عملی جدوجہد کے سہارے ترقی کی اور ناممکن کو ممکن بنا دکھایا۔ مزید یہ کہ اس نے اپنی غیر معمولی ذہانت، انتظامی صلاحیتوں اور اصلاحات کے ذریعے ہندوستان کو جدید دور کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

شیر شاہ کی سلطنت کی حدیں مشرق میں سنار گاؤں (نزد ڈھاکہ) سے لے کر مغرب میں اٹر کے علاقے میں گکھروں کے ملک تک، جنوب میں بندھیا پہاڑیوں تک اور شمال میں قراقرم کے پہاڑی سلسلوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وسیع سلطنت میں جہاں گیری اور جہاں بانی کے جو آثار و نقوش اس نے چھوڑے اور جو اصول و آئین نافذ کیے، وہ سنہرے حروف میں لکھے جانے اور قابلِ تقلید ہیں۔

مصنف شیر شاہ سوری کی انتظامی کامیابی کے راز کو واضح کرتے ہوئے وہ مزید لکھتے ہیں:

شیر شاہ انتظامی اعتبار سے ایک خود مختار سلطان تھا۔ دیوانی اور فوجی طاقتیں اس کے براہِ راست کنٹرول میں تھیں، لیکن اس کی حکومت کی بنیاد رعایا اور عوام کی فلاح و بہبود پر قائم تھی۔ اگرچہ وہ نظم و نسق کے لیے مختلف وزارتوں سے مدد لیتا تھا، اور یہ روایت سلاطینِ دہلی کے عہد سے چلی آرہی تھی، تاہم اس نے دیوانِ عرض، دیوانِ رسالت، دیوانِ انشا کے ساتھ ساتھ دیوانِ قضا اور دیوانِ برید کو بھی مؤثر طور پر برقرار رکھا۔ اس کے باوجود یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکومت کے تمام شعبے اس کی ہمہ جہت، مضبوط اور فعّال قیادت کے مرہونِ منت تھے۔ [۱۰]

شیر شاہ کی سلطنت مختلف صوبوں میں منقسم تھی اور اقطاع (جاگیر داری) کا نظام اس سے قبل بھی رائج تھا۔ مثال کے طور پر دریا خان لوحانی کو بہار کا مقطع مقرر کیا گیا تھا۔ شیر شاہ نے اقتدار میں آنے کے بعد صوبہ بہار کا صدر مقام بہار شریف سے منتقل کر کے پٹنہ میں بنا دیا۔ نہ صرف شیر شاہ کے عہد میں بلکہ اس کے جانشین سلیم شاہ سوری کے دور میں بھی اقطاعی نظام پوری طرح رائج اور فعّال رہا۔

شاہراہِ عام: شیر شاہ کا ایک اور عظیم الشان کارنامہ شاہراہِ عام، یعنی موجودہ گرینڈ ٹرنک روڈ (جی ٹی روڈ) کی تعمیر و توسیع ہے۔ اس کے علاوہ اُس نے قدیم ہند کی اُن شاہراہوں کی بھی تجدید کی، جن کی نسبت بعض روایات میں قدیم ادوار سے کی جاتی ہے۔

ان شاہراہوں میں سب سے نمایاں Grand Trunk Road ہے، جسے برطانوی دور میں "جرنیلی سڑک" کا نام دیا گیا۔ یہ شاہراہ تقریباً ۲۵۰۰ کلومیٹر طویل ہے اور بنگال سے شروع ہو کر کابل تک پہنچتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک سڑک آگرہ سے برہان پور تک، ایک آگرہ سے

---

[۱۰] ڈاکٹر حسن آرزو، سلطان شیر شاہ سوری: احوال و آثار، ص: ۱۰۲ - ۱۰۳۔

راجستھان کی سمت، اور ایک شاہراہ ملتان سے لاہور تک تعمیر یا مرمت کی گئی۔ یہ سڑکیں آج بھی مختلف ناموں سے ہندوستان، پاکستان اور افغانستان میں موجود ہیں۔ کالکارنجن قانون گو لکھتے ہیں:

> ملکِ بنگال میں سڑکیں خستہ حال تھیں، البتہ دریاؤں کے ذریعے آمد و رفت نسبتاً آسان تھی۔ چونکہ شمالی ہندوستان سے اس صوبے کو کوئی معیاری سڑک نہیں جاتی تھی، اس لیے یہ علاقہ دہلی سلطنت سے تقریباً الگ تھلگ رہا۔ سوانح نگار ضیاء الدین برنی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ صاحبِ رائے اور صاحبِ علم لوگ لکھنوتی (لکشمن وتی) کو "بلغاک پور" یعنی فساد کا شہر کہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب سے محمد غوری نے دہلی فتح کی، دہلی سے لکھنوتی بھیجے جانے والے اکثر گورنروں نے دوری اور عمدہ سڑکوں کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بغاوت کی۔ اگر کسی گورنر نے خود بغاوت نہ کی تو اُس کے خلاف کسی دوسرے نے علمِ بغاوت بلند کر دیا۔

کالکارنجن مزید لکھتے ہیں:

> مسلمان دور میں صوبے کے اندر فوجی شاہراہوں کی عدم موجودگی نے نہ صرف علاقائی تنفر کو تقویت دی بلکہ بغاوتوں کو بھی ہوا دی۔ جو سڑکیں فوج کشی کے دوران بنائی جاتی تھیں، صلح کے زمانے میں اُن کی دیکھ بھال نہیں ہوتی تھی، اور برسات کے موسم میں وہ بالکل ناقابلِ استعمال ہو جاتی تھیں۔[11]

ہندوستان کی اہم ترین شاہ راہوں کے ارد گرد درخت لگوانے اور ۱۷۰۰ کے قریب سرائیں تعمیر کروانے کا سہرا بھی شیر شاہ سوری کے سر جاتا ہے، تاکہ رہزنوں، ڈاکوؤں اور دیگر جرائم پیشہ عناصر سے مامون مسافروں کے ٹھہرنے کا انتظام کیا جا سکے، ان سراؤں میں مساجد، عبادت گاہیں، کنویں اور مسافروں کی جان مال کی حفاظت کے لیے ۲۴ گھنٹے عملہ موجود رہتا تھا، ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے کھانے پینے کا الگ الگ انتظام ہوتا تھا اور ان تمام انتظامات کا صرفہ ریاست کے ذمے تھا۔

کالکارنجن قانون گو لکھتے ہیں:

> مسافروں کے لیے جو سڑکیں تھیں بھی، ان کو رہزنوں اور چوروں کے خوف سے کوئی استعمال نہ کرتا تھا، شیر شاہ کے لیے بنگال میں ایسی صورتحال ناقابل برداشت تھی، اس نے اٹک سے لے کر دہلی تک ایک شاہراہِ عام کی تعمیر شروع کروادی تھی، وہ چاہتا تھا کہ آگے چل کر یہ سڑک سنار

[11] حوالہ سابق، ص: ۵۰۲-۵۰۳۔

گاؤں سے ملادی جائے، جو اندرونی تجارت کے لیے بنگال کی سب سے بڑی بندر گاہ تھا، سنار گاؤں اب اپنی عظمت دیرینہ کو کھو چکا تھا، وہ اب سلطنت کا صدر مقام بھی نہیں تھا، تاہم فنون حرب کے نقطۂ نظر سے اس کی اہمیت اس وقت تک قائم تھی، یہ اب ایک معمولی دیہات تھا جو اب شان ماضی کی ایک دھندلی سی نشانی رہ گیا تھا، یہ لکھیا اور میگھنا دریاؤں کے درمیان ڈھاکہ سے براہِ راست ۱۶ میل دور ہے، کبھی یہ سمندری جہازرانی کا بندر گاہ تھا۔ ابن بطوطہ اسی بندر گاہ سے جاوا ہوتا ہوا چین کو روانہ ہوا تھا، یہ ڈھاکہ سے پچیس میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ یہ شیر شاہ کی عظیم الشان شاہراہ کا آخری مقام تھا۔ [۱۲]

نقل وحمل کے ذرائع: شیر شاہ کی مدتِ حکمرانی محض پانچ برس پر مشتمل تھی، لیکن اس مختصر عرصے میں اُس نے ذرائعِ سفر اور نقل وحمل کو آسان بنانے کے لیے غیر معمولی اقدامات کیے۔ اُس نے اپنے قلمرو میں عمدہ سڑکوں کا جال بچھا دیا اور مسافروں کے جان ومال کے تحفظ کے لیے مؤثر انتظامات کیے۔

۱. سب سے بڑی اور اہم شاہراہ شمال مغربی علاقے میں دریائے سندھ کے کنارے سے سونار گاؤں تک جاتی تھی۔ عبد القادر بدایونی کے مطابق یہ راستہ چار ماہ میں طے کیا جاتا تھا۔
۲. دوسری سڑک آگرہ سے شروع ہو کر مختلف علاقوں سے گزرتی ہوئی برہان پور تک پہنچتی تھی۔
۳. تیسری سڑک آگرہ کو چتوڑ سے ملاتی تھی۔
۴. چوتھی سڑک ملتان کو لاہور سے مربوط کرتی تھی۔

ان شاہراہوں کی تعمیر سے ملک کے اندر تجارتی اور ثقافتی تعلقات کے فروغ اور استحکام میں نمایاں مدد ملی۔

مسافروں کی سہولت کے لیے ہر دو میل کے فاصلے پر ایک سرائے تعمیر کی گئی، جہاں ہر مسافر چند روز تک سرکاری مہمان کی حیثیت سے قیام کر سکتا تھا۔ ہر سرائے میں ایک مسجد اور ایک کنواں تعمیر کیا گیا۔ سڑکوں کے دونوں جانب مناسب فاصلے پر گھنے سایہ دار اور پھل دار درخت لگوائے گئے۔ غیر مسلم مسافروں کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُن کے لیے الگ سہولیات فراہم کی گئیں۔ نظم ونسق کے قیام کے لیے شیر شاہ نے چوری اور ڈاکہ زنی پر سخت سزائیں مقرر کیں۔

---

[۱۲] حوالہ سابق، ص: ۵۰۳ - ۵۰۴۔

اگر چور گرفتار نہ ہوتا تو اُس کے جرم کا تاوان قریبی دیہات سے وصول کیا جاتا۔ اس خوف سے دیہات کے لوگ خود ہی بدقماش عناصر پر نظر رکھتے اور امن برقرار رکھنے میں حکومت کی مدد کرتے تھے۔

ایک مؤرخ کے بقول:

شیر شاہ نے بنگال کی سیاسی اور طبعی علیحدگی کو ختم کر کے اسے دہلی سلطنت کا باقاعدہ حصہ بنا دیا۔ اُس نے یہاں بھی وہی انتظامی نظام –سرکار اور پرگنوں کی تقسیم– رائج کیا جو باقی ہندوستان میں مروج تھا۔ سڑکوں کا جال بچھا کر اس صوبے کو شمالی ہندوستان کی آخری سرحد تک ملا دیا۔ اس علیحدگی اور جمود کو دور کرنے میں سیاسی وحدت سے زیادہ تجارت نے کردار ادا کیا۔ شیر شاہ بنگال کی تجارت کو فروغ دینا چاہتا تھا، جس کے لیے اُس نے دو بنیادی اقدامات کیے: اوّل، سڑکوں کے ذریعے مال کی آمد و رفت کو محفوظ بنایا؛ دوم، محصولات (ٹیکس) کی وصولی کے طریقۂ کار کو سہل اور منظم کیا۔[۱۳]

کسانوں اور جاگیر داروں کے مسائل کا حل: شیر شاہ سوری نے اپنے عہدِ حکومت میں متعدد زرعی اور مالیاتی اصلاحات نافذ کیں۔ اُس نے اپنی جاگیر میں امن و امان قائم کیا، زمین کی منصفانہ تقسیم کو یقینی بنایا، سرکاری کاتب مقرر کیے اور اُن افسران کو سخت سزائیں دیں جو کسانوں سے رشوت طلب کرتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس کی اصلاحات کے نتیجے میں جاگیروں کی آمدنیاں بہت بڑھ گئیں۔

شیر شاہ کا اصولی موقف یہ تھا کہ ملک کو خوشحال بنانے کے لیے سب سے پہلے کسان کو خوشحال بنانا ضروری ہے۔ اُس نے فی بیگھا زمین پر ڈھائی سیر اناج بطورِ لگان مقرر کیا، جب کہ اس سے قبل عموماً پیداوار کا تیسرا حصہ وصول کیا جاتا تھا۔ زمین کو زرخیزی کے اعتبار سے تین درجوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر درجے کے مطابق مالیہ مقرر کیا گیا۔ لگان کو زمین کی اصل پیداوار کے مطابق متعین کیا گیا۔ اس سے پہلے یہ رواج تھا کہ چاہے قحط ہو یا سیلاب، ہر حال میں خراج وصول کیا جائے گا، مگر شیر شاہ نے کسانوں کے استحصال کو روکنے کے لیے سخت اقدامات کیے، بدعنوان اہلکاروں کو سزائیں دی گئیں اور کھاتہ داروں کے حسابات کی باقاعدہ جانچ کا حکم دیا گیا۔ چند ہی برسوں میں نہ صرف پیداوار میں اضافہ ہوا بلکہ کسانوں کی معاشی حالت بھی بہتر ہو گئی۔ ودیا ساگر بھاسکر لکھتے

---

[۱۳] حوالہ سابق، ص: ۵۰۵ - ۵۰۶۔

ہیں:

ایک فرمان کے ذریعے شیر شاہ نے فوجوں کو روانہ کرتے وقت تاکید کی کہ کسانوں کی فصلوں کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ فوج کی روانگی کے وقت وہ خود فصلوں کی نگرانی کرتا اور اُن کی حفاظت کے لیے چاروں طرف گھڑ سوار سپاہی متعین کر دیتا۔ وہ عموماً کسی بلند مقام پر کھڑا ہو کر فوج کے ہر فرد پر نظر رکھتا۔ اگر کوئی سپاہی جان بوجھ کر فصل کو نقصان پہنچاتا دکھائی دیتا تو وہ موقع پر پہنچ کر اُسے سخت سزا دیتا، حتیٰ کہ اُس کے کان کاٹ دیے جاتے اور کٹی ہوئی بالیاں اُس کے گلے میں ڈال کر پوری فوج میں گھمایا جاتا۔(۱۴)

کتاب ''واقعاتِ مشتاق'' اور ''تاریخِ داؤدی'' کے مطابق ایک مرتبہ مالوہ کی مہم کے دوران ایک سپاہی نے کھیت سے ہرے مٹر توڑے تو اُسے سخت سزا دی گئی۔ اس سختی کے بعد کسی سپاہی کو فصلوں کو نقصان پہنچانے کی جرأت نہ ہوئی۔ اگر راستہ تنگ ہونے کے باعث فوج کو کھیتوں کے درمیان سے گزرنا پڑتا اور فصل کو نقصان پہنچتا تو سرکاری خزانے سے مناسب معاوضہ ادا کیا جاتا۔ اگر فوج کو کھیتوں کے قریب قیام کرنا پڑتا تو سپاہی خود فصلوں کی نگہبانی کرتے تھے تاکہ کوئی نقصان نہ ہو، کیونکہ شیر شاہ سزا دینے میں نرمی نہیں برتتا تھا۔

مزید برآں، جب وہ کسی دشمن کا علاقہ فتح کرتا تو اُس کے سپاہیوں کو مقامی کسانوں کو لوٹنے یا غلام بنانے کی اجازت نہ ہوتی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ کاشتکار غریب اور بے گناہ ہوتے ہیں، وہ اسی کی اطاعت کرتے ہیں جو اُن پر اقتدار رکھتا ہو۔ اگر اُن پر ظلم کیا جائے تو وہ کھیتی باڑی چھوڑ کر جنگلوں میں چلے جائیں گے، جس سے علاقہ ویران ہو جائے گا اور اسے دوبارہ آباد کرنے میں طویل وقت اور محنت درکار ہو گی۔ معروف ہے کہ اُس کے دشمن بھی اُس کی سخاوت، انصاف پسندی، منصف مزاجی اور غیر جانب داری کے معترف تھے، حتیٰ کہ بعض اوقات وہ اُس کی فوج کو رضاکارانہ طور پر رسد بھی فراہم کرتے تھے۔(۱۵)

انتظام وانصرام کے نئے زاویے: شیر شاہ سوری نے نظمِ حکومت کو مستحکم بنانے کے لیے نئے عہدے مقرر کیے اور اُن کے فرائض واختیارات کی واضح حدود متعین کیں۔ پرگنہ کی سطح پر جو عمال

---

(۱۴) ودیا بھاسکر، شیر شاہ سوری، ص ۹۷

(۱۵) ودیا بھاسکر، شیر شاہ سوری، ص: ۹۸- ۹۹۔

مقرر کیے جاتے تھے، اُن میں شق دار سب سے اہم عہدے دار ہوتا تھا۔ پرگنہ کا عمومی نظم و نسق اُسی کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ایک امین یا منصف مقرر کیا جاتا تھا۔ ان دونوں کے تقرر کا مقصد یہ تھا کہ حکومت اور کاشتکار کے درمیان انصاف اور امانت داری کا رشتہ قائم رہے۔ امین کے فرائض میں فصلوں کا معاینہ، مال گزاری اور خراج کی وصولی کی نگرانی شامل تھی۔

پرگنہ میں ایک خزانچی بھی ہوتا تھا، جسے **فوطہ دار** کہا جاتا تھا۔ حساب کتاب فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں تحریر کیا جاتا تھا۔ **قانون گو** کے پاس مال گزاری سے متعلق تمام سرکاری دستاویزات محفوظ رہتی تھیں، جن سے گزشتہ برسوں کی مالی کیفیت معلوم کی جاسکتی تھی۔ ودیا ساگر بھاسکر لکھتے ہیں:

> شیر شاہ نے سلطنت کے خزانے میں اضافہ، زراعت کی ترقی اور مال گزاری کی منظم و بروقت وصولی کے لیے نہایت آسان اور قابلِ عمل قواعد مرتب کیے۔ اُس نے ہر پرگنے میں ایک امین، ایک رحم دل شق دار، ایک خزانچی، ایک فارسی محرر اور ایک ہندی محرر (منشی) مقرر کیا۔ ہر فصل کے بعد زمین کی پیمائش کا حکم دیا گیا تاکہ لگان، پیمائش اور پیداوار کے تناسب سے وصول کیا جائے۔ اُس نے قانون بنایا کہ کاشتکار سے پیداوار کا ایک متعین حصہ لیا جائے اور اُس کا نصف مقدم کو دیا جائے۔ اس طرح لگان منصفانہ بنیادوں پر وصول ہونے لگا اور غریب کسان مقدموں، چودھریوں اور عاملوں کے ظلم و ستم سے محفوظ ہو گئے۔ [16]

شیر شاہ کے اقتدار سے قبل ہر پرگنے میں ایک قانون گو موجود ہوتا تھا، جس کے پاس گزشتہ، موجودہ اور آئندہ متوقع پیداوار کا ریکارڈ محفوظ رہتا تھا۔ شیر شاہ نے ہر سرکار میں ایک شق دارِ شق داران اور ایک منصفِ منصفان (چیف جسٹس) مقرر کیا۔ اُنھیں سرکاری عاملوں کے رویّے اور عوام کے معاملات کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی۔ ہدایت کی گئی کہ وہ عاملوں کو رعایا پر ظلم کی اجازت نہ دیں اور نہ ہی مال گزاری میں خیانت کا موقع فراہم کریں۔

شقدارِ شقداران کو زمین اور حدودِ اراضی سے متعلق جھگڑوں کے تصفیے کا اختیار بھی دیا گیا۔ اس کے علاوہ سرکار میں امن وامان برقرار رکھنے کی ذمہ داری بھی اُن پر عائد تھی۔ اگر کوئی کاشتکار لگان کی ادائیگی میں بغاوت پر آمادہ ہوتا تو افسران کو اختیار تھا کہ وہ ریاستی قوت کے ذریعے نظم قائم

(16) ماخذ سابق

کریں۔ شیر شاہ اپنے عہدے داروں کے تقرر و تبادلے کے معاملے میں بھی محتاط تھا۔ وہ ہر سال یا کم از کم ہر دوسرے سال اپنے کارندوں کا تبادلہ کر دیتا تھا۔ اس بارے میں اُس کا قول ہے:

میں نے غور و خوض کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایک ضلع میں طویل عرصہ تک اقتدار رکھنا بہت نفع بخش ہوتا ہے۔ اس لیے میں اپنے قدیم اور وفادار خدمت گاروں کو ضلعوں کا منتظم بنا کر بھیجتا ہوں تا کہ وہ مستفید ہوں؛ لیکن چونکہ میں چاہتا ہوں کہ میرے تمام خیر خواہوں اور خدمت گاروں کو فائدہ پہنچے، اس لیے میں اُنھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتا رہتا ہوں۔[۱۷]

یہ پالیسی دراصل اختیارات کے ارتکاز کو روکنے، بدعنوانی کے امکانات کم کرنے اور ریاستی نظم کو متوازن رکھنے کی ایک مؤثر تدبیر تھی۔

فتوحات اپنی جگہ اہم سہی، مگر شیر شاہ سوری کی اصل پہچان اور سب سے بڑی کامیابی اُس کا نظامِ حکومت ہے۔ اُس کی ذہانت کا حقیقی اظہار میدانِ جنگ سے زیادہ انتظامی اصلاحات میں نظر آتا ہے۔ صرف پانچ برس کی مختصر مدت میں اُس نے ایسی اصلاحات نافذ کیں جنھوں نے برصغیر کے سیاسی و معاشی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا، اور جن کے اثرات آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

اگر اس پہلو پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت قابلِ توجہ ہے کہ آج دنیا کی تقریباً ایک چوتھائی آبادی جس کرنسی (سکہ) کا استعمال کرتی ہے، اُس کا نام اور تصور بڑی حد تک شیر شاہ کے جاری کردہ چاندی کے سکے **"روپیہ"** سے ماخوذ ہے۔ یہ اُس کے وژن اور معاشی بصیرت کا ایک ثبوت ہے۔

شیر شاہ کا نظامِ حکومت بنیادی طور پر چار ستونوں پر قائم تھا:

۱. معیاری کرنسی اور مضبوط بنیادی ڈھانچہ (Infrastructure): اُس نے خالص چاندی کا معیاری "روپیہ" جاری کیا، جس نے پورے ملک میں تجارت کو آسان، محفوظ اور منظم بنا دیا۔ ایک متحدہ اور مستحکم کرنسی نے اقتصادی سرگرمیوں کو نئی رفتار دی۔

۲. **شاہراہوں کا جال:** خصوصاً مشہور Grand Trunk Road، جس نے سلطنت کے مختلف حصوں کو آپس میں جوڑ دیا۔ اس شاہراہ نے نہ صرف فوجی نقل و حرکت کو سہل بنایا بلکہ تجارت، ثقافتی روابط اور سیاسی ہم آہنگی کو بھی فروغ دیا۔

۳. **معاشی اصلاحات:** غیر ضروری محصولات اور داخلی محصولات (Custom Duties)

---

[۱۷] ماخذ سابق، ص: ۹۱- ۹۲۔

میں کمی کی گئی تاکہ تجارت کو فروغ ملے۔ محصولات کی وصولی کو منظم اور شفاف بنایا گیا، جس سے کاروباری طبقے کا اعتماد بحال ہوا۔

۴. **مذہبی رواداری:** یہ اُس کی پالیسیوں کا سب سے اہم پہلو تھا۔ اگرچہ وہ ذاتی طور پر ایک دیندار مسلمان اور پابندِ صوم وصلوٰۃ تھا، مگر حکمرانی کے معاملات میں اُس نے غیر جانب دار طرزِ عمل اختیار کیا۔ اُس کی پالیسیاں رعایا کے تمام طبقات کے لیے یکساں تھیں، خواہ اُن کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو۔ اُس دور کے سیاسی ماحول میں یہ رویہ غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔

مثل مشہور ہے کہ ہر عروج کو زوال ہے۔ شیر شاہ کی سلطنت کا زوال بھی اُس کے عروج کی طرح اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ایک ایسی سلطنت، جو ممکنہ طور پر تاریخ کا رخ بدل سکتی تھی، ایک حادثاتی واقعے کے سبب کمزور پڑ گئی۔ شیر شاہ کی وفات کسی دشمن کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں نہیں ہوئی، بلکہ قلعہ کالنجر کے محاصرے کے دوران بارود کے ایک حادثاتی دھماکے میں ہوئی۔ اسی سانحے نے اُس عظیم حکمران کے عہد کا اچانک خاتمہ کر دیا۔

شیر شاہ سوری اور ہمایوں کے تعلقات: ہمایوں اور شیر شاہ سوری کے درمیان تعلقات بنیادی طور پر شدید جنگی اور حریفانہ تھے، کیوں کہ شیر شاہ نے مغل سلطنت کو ختم کر کے ہندوستان میں سوری سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، تاہم سیاسی مصلحت کے تحت کچھ مواقع پر ان کے درمیان وقتی صلح یا سفارتی رابطے بھی ہوئے۔

بابر کی وفات کے بعد اس کا جانشین ہمایوں بنگال کو فتح کرنے کا خواہاں تھا، تاہم شیر شاہ سوری کی عمل داری اس کے راستے میں حائل تھی۔ چنانچہ ہمایوں نے شیر شاہ سے تصادم کا ارادہ کر لیا۔ اس صورتِ حال نے شیر شاہ کے سیاسی عزائم میں مزید اضافہ کر دیا، کیونکہ اس وقت بہار اور بنگال پر اس کا مکمل کنٹرول قائم ہو چکا تھا، اور اسی بنا پر وہ مغل بادشاہ ہمایوں کے لیے ایک سنگین خطرہ بن گیا تھا۔

فوجی مہارت اور جنگی حکمتِ عملی کے اعتبار سے شیر شاہ، ہمایوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط اور تجربہ کار تھا۔ ۱۵۳۷ء عیسوی میں چوسہ کے مقام پر دونوں افواج آمنے سامنے آئیں، تاہم باقاعدہ جنگ کے آغاز سے قبل ہمایوں نے شیر شاہ کے پاس ایک قاصد روانہ کیا، جس کا مقصد

حالات کا جائزہ لینا اور ممکنہ مفاہمت کی راہ تلاش کرنا تھا۔ کوئی راستہ نہ دیکھ کر مجبوراً ہمایوں صلح کے لئے جھکا۔ لڑائی روز بروز اس وقت تک چلتی رہی جب تک شیر شاہ سے صلح کرنا ہی مناسب معلوم ہوا۔ ہمایوں نے شیخ خلیل جو شیخ فرید شکر گنج کے خاندان سے تھا۔ وہ صلح کا پیغام لے کر شیر خاں کے پاس گیا۔ شیر خاں اس شرط پر راضی ہو گیا چنار کا قلعہ مع قلعہ کا باہری مشرقی علاقہ اس کو دے دیا جائے۔ شیخ نے ہمایوں کو مطلع کیا کہ " شیر خاں کو چنار کے قلعہ پر کچھ اعتراض ہے۔ ہمایوں کے امراءو سرداروں نے شیر خاں کو قلعہ سونپ دینا مناسب نہ سمجھا بالآخر صلح کی شرط رد ہو گئی۔ ۔۔۲۶ جون ۱۵۳۹ عیسوی کو بوقت فجر صبح کی ٹھنڈی ہوا مغلوں کو لوریاں دے کر سلا رہی تھی۔ افغان دفعتاً ان پر بجلی کی طرح ٹوٹ پڑے اور اس جنگ میں شیر خان کی فتح ہوئی۔ [۱۸]

چوسا کے جنگ کے بعد، ہمایوں نے دوبارہ شیر شاہ کا سامنا کیا، لیکن قنوج کی اس فیصلہ کن جنگ میں شیر شاہ نے ہمایوں کو مکمل طور پر شکست دے کر دہلی اور آگرہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد ہمایوں کو ہندوستان چھوڑ کر جلاوطنی اختیار کرنی پڑی۔

شیر شاہ سوری سلطنت کے زوال کے اسباب: سوری کی سلطنت کا زوال بنیادی طور پر اس کے بانی شیر شاہ سوری کی وفات سے شروع ہوا، جن کی غیر معمولی انتظامی اور فوجی قیادت و صلاحیت سلطنت کے استحکام کا ستون تھی۔ ان کی وفات کے بعد، باصلاحیت اور حکومت کے انتظام و انصرام چلانے کے قابل جانشینوں کی فقدان کے باعث زوال کا شکار ہو گئی۔ اگرچہ اسلام شاہ اور ان کے چاہنے والوں نے سخت مدبرانہ اقدامت کے ذریعہ کچھ حد تک قابو برقرار رکھا، لیکن بعد میں آنے والے حکمران نہایت کمزور ثابت ہوئے اور اتنے بڑے وسیع و عریض علاقے کو سنبھالنے میں ناکام ثابت ہوئے۔ انتظام حکومت کے اس ناکامی نے سوری شہزادوں اور وارثوں کے درمیان آپسی چپقلش اور خلفشار نے خانہ جنگی کو جنم دیا، نتیجہ حکومت کو شہزادوں اور وارثوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ مزید افغانوں خصوصاً افغان امرا کی بے وفائی اور بغاوتوں نے جو امرا حل و عقد کو پسند نہیں کرتے تھے، ریاست کے فوجی اتحاد کو شدید سے شدید تر زک پہنچائی۔ ان تمام اسباب نے مغل شہنشاہ ہمایوں کو جلاوطنی سے واپسی اور اپنی سلطنت حاصل کرنے کا سنہرا موقع فراہم کیا، جس کا اختتام ۱۵۵۵ عیسوی میں سرہند کی جنگ میں سوریوں کی فیصلہ کن شکست پر ہوا۔

---

[۱۸] کالکارنجن قانون گو، شیر شاہ اور اس کا عہد، ص: ۳۳۴-۳۳۶

مسلم معاشرے کی خرابیاں اور ان کے سدھار کی سبیل

ڈاکٹر ظفر الاسلام خان

میں ان مسائل کے بارے میں بولتا اور لکھتا رہا ہوں لیکن شاید اتنی وضاحت سے نہیں جس کی ضرورت ہے۔ مسائل بہت ہیں جن کا تعلق حکومت، عدلیہ، پولیس اور میڈیا وغیرہ سے ہے لیکن یہاں ہم صرف ان امور کے بارے گفتگو کریں گے جو ہمارے معاشرے کے اندرونی مسائل ہیں اور جو ہماری اپنی اندرونی کمزوریاں ہیں جنھیں خود ہم ہی دور کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ہم اپنی **سیاسی صورت** حال پر نظر ڈالتے ہیں۔ آج ہم اپنے آپ کو ایک کونے میں کھڑا ہوا پاتے ہیں۔ مختلف قسم کے چیلنجز ہمارے سامنے ہیں لیکن نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے۔ ہندوتوا یا نفرت کی سیاست نے ہم کو ایک حد تک الگ تھلگ کر دیا ہے یا کم از کم اس کی کوشش ہو رہی ہے۔ لیکن کیا یہ سب اچانک ہو گیا؟ کیا ہم یا ہماری قیادت اس کی ذمے دار نہیں؟

ہمارے مسائل سنہ ۱۸۵۷ سے شروع ہوتے ہیں جب انگریز سامراجیوں نے ہم کو "غدر" کا ذمے دار قرار دے کر جی کھول کر ہم کو قتل کیا، ہماری جائدادیں چھینیں اور ہم کو حاشیے پر کھڑا کر دیا۔ بیس، تیس سال تک ہم کسی ردّعمل سے قاصر رہے۔ اس دوران ایک مرد مجاہد — سید احمد خان — کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی حکمت عملی سے ایک طرف انگریزوں کا غصہ ٹھنڈا کیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو وہ واحد راستہ دکھایا جو موجودہ دور میں ترقی کے لئے سب کو میسر ہے، یعنی جدید تعلیم۔ اس مرد مجاہد کو بڑی گالیاں دی گئیں، کافر گردانا گیا، جوتے چپل سے مارا گیا، لیکن اس نے ہار نہ مانی اور سنہ ۱۸۷۵ میں علی گڑھ میں ایک کالج بنا کر دم لیا۔ یہ کالج سنہ ۱۹۲۰ میں ایک یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے اس طرح کے اور کالج اور بعد میں یونیورسٹیاں پورے برصغیر میں بنیں جن کی بدولت مسلمان پھر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے لگے لیکن سیاسی طور پر مسلمانوں نے دور رس حکمت عملی نہیں اپنائی بلکہ جذباتی سیاست اور جذباتی سیاستدانوں کا شکار بنتے چلے گئے۔ سنہ ۱۹۲۰ میں ہم نے تحریکِ ہجرت کے نام پر ایک احمقانہ تحریک چلائی۔ دسیوں ہزار نوجوان اپنے گھر بار اور

زمینیں اونے پونے بیچ کر "قندھار چلو، قندھار چلو۔ دریائے اٹک کے پار چلو" کا نعرہ لگاتے ہوئے افغانستان ہجرت کر گئے۔ یہ ایک پوری طرح جذباتی اور احمقانہ فیصلہ تھا۔ نعرہ لگوانے والوں نے افغانستان کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا بغور مطالعہ نہیں کیا تھا کہ کیا یہ لوگ وہاں بس سکتے ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے لئے وہاں سے کیسے کام کر سکتے ہیں۔ زندگی کے عملی مسائل اور افغانی حکام کی سرد مہری کی وجہ سے چند ہی مہینے میں یہ لوگ نامراد و شکستہ حالت میں واپس چلے آئے۔ واپس آنے والوں میں خان عبدالغفار خان بھی تھے جنہوں نے باقی زندگی اس قسم کے جذباتی نعروں سے توبہ کی اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں دل وجان سے شریک ہو گئے۔

تحریک ہجرت کی ناکامی سے ہماری جذباتی اور جوشیلی قیادت نے کوئی سبق نہیں لیا بلکہ جلد ہی ان کو ہزاروں میل دور ترکی میں خلافت عثمانیہ کو بچانے کا خیال آگیا۔ نتیجۃً اس قیادت نے پوری قوم کو تحریکِ خلافت کے نام پر کئی سال نچائے رکھا یہاں تک کہ سنہ ۱۹۲۴ میں جب مصطفی کمال نے ترکی میں خلافت کے خاتمے کا اعلان کر دیا تو ہندوستان میں بھی تحریک خلافت کا غبارہ پھوٹ گیا۔ ان لوگوں کو جذبات اور خیالی نعروں کے علاوہ ان زمینی حالات کا کوئی علم نہیں تھا جن کی وجہ سے خلافت عثمانیہ خود اپنے ملک اور دوسرے قریبی مسلم ممالک میں مطعون ہو چکی تھی اور خود وہاں کے لوگ اس سے گلو خلوصی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مصطفی کمال کو سلطنت ختم کرنے اورآخری خلیفہ محمد ششم کو نومبر ۱۹۲۲ میں صرف چند گھنٹوں کے نوٹس پر ترکی سے ملک بدر کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ یوں اس لایعنی تحریک نے ہندوستان میں بھی دم توڑ دیا۔

تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد ہماری جذباتی قیادت کو پاکستان کا نعرہ مل گیا اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں کو چھوڑ کر پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو اس مسئلے پر برسوں الجھا کر رکھا گیا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ میں ملک بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی تقسیم ہوئی جس میں لاکھوں لوگ مارے گئے، نوے لاکھ کے قریب مسلمان اپنی خواہش سے یا مجبور ہو کر پاکستان ہجرت کر گئے۔ تقسیم کے ذمے دار مسلم لیگ، کانگریس اور انگریز سب تھے لیکن ٹھیکرا عضو ضعیف یعنی ہندوستانی مسلمانوں کے سر پھوٹا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ پاکستان بننے سے باقی ماندہ ہندوستان میں مسلمانوں کی ساکھ ٹوٹ گئی، ہمارے قائدین پاکستان بھاگ گئے یا گھروں میں چھپ گئے۔ دانشوروں کا ایک بڑا خلا پیدا ہو گیا جو اب تک بھی پُر نہیں ہوا ہے۔ معاشیات بھی ایسے تباہ ہوئی کہ مسلمان آج تک

دوبارہ ۱۹۴۷ سے پہلے والی حالت پر واپس نہیں آیا ہے۔

اس کے بعد ۱۹۸۰ کی دہائی میں دو اور جذباتی تحریکوں نے ہمارے یہاں جنم لیا: شاہ بانو یا پرسنل لا تحریک اور بابری مسجد تحریک۔ دونوں تحریکوں میں عقل سے کم اور جذبات سے زیادہ کام لیا گیا۔ نعرہ لگانے والے لیڈر بن گئے اور مسلمانوں کو برسوں نچاتے رہے۔ دسمبر ۱۹۹۲ میں بابری مسجد کی شہادت کے ساتھ یہ قیادت بھی زمین دوز ہو گئی۔ تب سے آج تک ہمارے یہاں کوئی نئی قیادت نہیں ابھری ہے۔

نئے ہندوستان میں جو سماجی، سیاسی اور معاشی صورت حال بنی تھی اور جس طرح ہم ہر طرح حاشیے پر آ گئے تھے، اس کی وجہ سے جذباتی سیاست کی ناکامی نوشتۂ دیوار بن چکی تھی اور ہمیں کوئی اور طریقہ اپنانا تھا جیسے جاپان اور جرمنی نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنایا۔ ان دونوں ملکوں نے امریکہ کے خلاف مزاحمت یا جنگ جاری رکھنے کے بجائے اپنے ملک کی تعمیرِ نو کے فیصلے سے اپنی تقدیر چند دہوں میں بدل دی۔ افسوس ہے کہ ہمارے یہاں کوئی ایسی دور رس قیادت نہیں تھی جو ہم کو تعلیم اور معاشیات کی طرف موڑتی۔ نتیجتاً ہم صرف جذباتی سیاست کا شکار ہو کر اِس بند گلی سے اُس بند گلی کا چکر لگاتے رہے اور آج بھی منزل سے دور وہیں چکر لگا رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں نے کوئی ترقی کی ہے تو وہ افراد کی اپنی ذاتی سوجھ بوجھ اور پہل کی وجہ سے ہے، ہماری قیادت کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

میں یہ بالکل نہیں کہہ رہا ہوں کہ شاہ بانو اور بابری تحریکوں کا جو حشر ہوا وہی ہونا چاہئے تھا۔ یقیناً ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ہم کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ سیاسی اور قانونی حقوق زمینی حقائق سے الگ وجود نہیں رکھتے ہیں۔ ان مسائل کو کسی اور طریقے سے سڑک سے دور حل کرنا چاہئے تھا۔ شروع میں بابری مسجد کا مسئلہ ٹھنڈے طریقے سے حل کرنے کی کوشش کی گئی جس میں مسلمانوں کی سبکی نہ ہوتی۔ لیکن جذباتی اور جوشیلے قائدین نے ان کوششوں کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔ نتیجتاً ہمیں ایسی ناکامی ملی ہے کہ ہم سر اٹھانے اور بولنے کے بھی قابل نہیں رہے۔

ہماری اسی جذباتی سیاست سے نفرت کی اُس سیاست کو بھی تقویت ملتی چلی گئی جو ملک کے دستوری ڈھانچے کے بدلنے کے درپے ہے حالانکہ اب بھی اس ملک میں ایسے بہت سے انصاف پسند لوگ موجود ہیں جو قانون اور دستور کی حمایت میں کھڑے ہیں لیکن ان کی تعداد بھی روز بروز

کم سے کم تر ہوتی چلی جارہی ہے۔

آزادی کے بعد ہماری ایک بڑی کمی رہی ہے کہ ہم نے اپنی زمینی طاقت بنانے کے بجائے چند پارٹیوں اور چند سیاستدانوں کی آنکھ بند کرکے تایید کی اور ملک کی ابھرتی ہوئی طاقتوں سے ڈائیلاگ کرنے کے بجائے، ان کو صرف چیلنج کرتے رہے۔ ان نئی طاقتوں سے کوئی تال میل نہ بنانا بلکہ الٹا انھیں دشمن بنالینا کسی طرح کی عقلمندی نہیں تھی۔ آج بھی ضرورت ہے کہ ہم کسی ایک پارٹی کی تایید کرنے یا لوگوں کو صرف اسے ووٹ دینے کی صلاح دینے کے بجائے عوام پر چھوڑ دیں کہ وہ عمدہ کارکردگی کی بنیاد پر جس امیدوار کو چاہیں اپنے حلقے میں ووٹ دیں۔ پچھلے سالوں میں ہم نے دیکھ لیا کہ کوئی سیاسی پارٹی ہمارے ساتھ نہیں ہے۔ ہم پر بڑے سے بڑے طوفان آئے لیکن کوئی بولنے تک کو تیار نہیں ہے۔ ایسے حالات میں ہم کیوں کسی سیاسی پارٹی کا دم چھلہ بنیں اور کیوں کسی سیاسی پارٹی سے دشمنی کو اپنی ملی سیاست بنائیں؟

اپنے حقوق کے لئے اور مظالم کے خلاف اداروں اور عدالتوں کے ذریعے ہمارے حقوق کی لڑائی قانون کے تحت جاری رہنی چاہئے۔ لیکن یہ کچھ افراد اور تنظیمیں کریں گی، پوری قوم کو ہم ان امور پر سڑکوں پر نہیں لائیں گے اور نہ ہی علانیہ کسی کے خلاف سب وشتم کے مرتکب ہوں گے۔ اس قانونی لڑائی میں ہم سماج کے ایک بڑے حصے کو دشمن نہیں بنائیں گے۔ ہم کو سماج کی تمام نمائندہ طاقتوں اور پارٹیوں کے ساتھ تعلقات، بات چیت اور ڈائیلاگ جاری رکھنا چاہئے۔ سیاست میں کوئی اچھوت نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اس حکمت عملی پر عمل کرنا چاہئے۔

ہمارے ساتھ یہ مسئلہ بھی رہا ہے کہ جن مسائل کے بارے ہمارا خیال ہے کہ وہ براہِ راست ہم پر اثرانداز ہوتے ہیں، ہم انھیں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ سماج میں جو دوسرے مسائل ہیں اور جو زیادتیاں ہو رہی ہیں ہمیں ان سے سروکار نہیں ہوتا ہے۔ ہمیں یہ رویہ بدلنا ہوگا اور ہمیں ان سارے مسائل میں دلچسپی لینی ہوگی جن کا ملک کے حاضر اور مستقبل سے تعلق ہے۔

معاشی مسائل: ہندوستانی مسلمانوں کی اکثریت غریب ہے۔ ہماری تنظیموں نے آج تک مسلمانوں کی معاشی حالت بہتر کرنے کے لئے کوئی نقشہ یا پروگرام نہیں بنایا۔ ہر مصیبت ان کو چندہ جمع کرنے کا موقعہ نظر آتی ہے۔ ”سود“ کے حرام ہونے کے نام پر ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو قرضہ نہیں دیتا ہے۔ تنظیموں نے اس کے لئے کوئی نظم نہیں بنایا۔ ایسی حالت میں جو مسلمان کسی وجہ سے

قرضے کے محتاج ہوتے ہیں وہ دوسروں سے، اور اکثر مسلمانوں سے ہی، بڑے اونچے سودی ریٹ پر قرضہ لیتے ہیں جس سے وہ برباد ہو جاتے ہیں۔ ''اسلامی معاشیات'' کا برسوں سے بڑا غلغلہ ہے لیکن آج تک کوئی ایسا قابل عمل ماڈل نہیں بن سکا جس سے غریب لوگوں کی بروقت مدد ہو یا جہاں عام مسلمان اپنی کمائی پونجی جمع کر سکیں۔ ہندوستان کے باہر جو ''اسلامی بینک'' بنے ہیں وہ ناکام ہیں بلکہ میرے ذاتی تجربے میں وہ عام بینکوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ یہ سنہ ۱۹۸۴ کی بات ہے کہ میں نے قاہرہ میں واقع فیصل اسلامی بینک میں چند ہزار ڈالر بطور انوسٹمنٹ جمع کئے۔ حساب کھولنے اور پیسے جمع کرنے کے لئے انہوں نے ''سروس'' کے نام پر چند سو ڈالر چارج کیے جو کوئی عام بینک نہیں لیتا ہے۔ اس کے بعد میں ہندوستان آ گیا اور مجھ کو یہاں پیسوں کی ضرورت پڑی تو وہ مذکورہ اکاؤنٹ بند کرنے کے لئے میں نے فیصل اسلامی بینک کو خط لکھا۔ انہوں نے حساب بند تو کر دیا لیکن ایک سال سے کم مدت میں بند کرنے کی سزا کے طور پر دوبارہ مجھ سے چند سو ڈالر اور کاٹ لئے۔ ایک عام بینک یہ کبھی نہیں کرے گا بلکہ زیادہ سے زیادہ انٹرسٹ میں سے کچھ رقم منہا کر لے گا۔

یہاں ہندوستان میں کافی دنوں سے اسلامی بینکنگ یا اسلامی فائننس کمپنیوں کا شور وقتاً فوقتاً اٹھتا رہتا ہے لیکن یہ سب ہمارے پیسوں کو لوٹنے والی کمپنیاں ہیں جیسے المیزان اور الفلاح نامی ادارے جن کو ہمارے بعض مفتیان نے فتوے بھی دے رکھے تھے۔ ایسی کمپنیوں میں ہزاروں کروڑ کھونے کے باوجود ہم نے کوئی سبق نہیں سیکھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل نوہیرہ شیخ نامی عورت نے بھی مسلمانوں کے ہزاروں کروڑ روپئے اسلامی فائننس کے نام پر تباہ کئے۔ اس کے علاوہ مختلف شہروں میں اسلامی فنڈ نام کی چھوٹی چھوٹی دکانیں قائم ہیں جن سے مسلمانوں کی ضروریات نہیں پوری ہوتی ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی معاشی ترقی نہیں ہوتی اور رہی سہی پونجی بھی برباد ہو جاتی ہے نیز کوئی معقول بزنس کرنے کے لئے ان کو کوئی قرض دینے والا بھی نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارے ایسے لاکھوں لوگ موجود ہیں جو بینکوں سے ملنے والے انٹرسٹ کو وہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ بعض اخباری رپورٹوں میں دعوی کیا گیا ہے کہ ہندوستانی مسلمان اس طرح ہر سال ہزاروں کروڑ روپئے بینکوں میں چھوڑ دیتے ہیں یا بینکوں میں اپنے پیسے رکھتے ہی نہیں ہیں جس کی وجہ سے ان کے پیسے کالا دھن میں شمار ہوتے ہیں۔ نومبر ۲۰۱۶ میں نوٹ بندی کی وجہ سے ایسے لوگوں کا بڑا نقصان ہوا جو اپنے پیسے گھروں میں رکھتے تھے۔ ہمارے ایک رشتہ دار ہر سال انٹرسٹ

کی رقم بینک سے نکال کر اسے جلاتے تھے حالانکہ انہیں کے شہر میں ہزاروں غریب وفقیر مسلمان رہتے تھے جن کے لئے مجبوراً سور کا گوشت کھانا بھی حلال ہو جاتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات قابل غور ہے کہ بینکوں کا انٹرسٹ یا منافع وہ "سود" یعنی ربا نہیں ہے جس کو اسلام میں حرام قرار دیا گیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بینک ہم سے قرضہ نہیں لیتا ہے بلکہ ہم خود بینک میں اپنی ضرورت اور حفاظت کی خاطر اپنے پیسے جمع کراتے ہیں، پھر وہ ان پیسوں کو دوسرے ضرورت مندوں کو قرضے پر دے کر ان سے منافع لیتا ہے جس کا کچھ حصہ پیسہ جمع کرنے والوں کو ملتا ہے اور یہ حصہ متعین نہیں ہوتا ہے بلکہ کم یا زیادہ ہو سکتا ہے اور کبھی نہیں بھی ملتا ہے۔ عصر حاضر میں افراط زر (Inflation) کی وجہ سے پیسوں کی قیمت مستقل کم ہوتی رہتی ہے جو ہمارے ملک ہیں تقریباً ۹-۱۰ فیصد سالانہ ہوتی ہے۔ جب تک سونے اور چاندی کے سکوں کا رواج تھا افراط زر کا وجود نہیں تھا، بلکہ صدیوں سامانوں کے دام ایک ہی رہتے تھے۔ اب جو رقم ہمیں بنک "انٹرسٹ" کے نام پر دیتا ہے وہ افراط زر کے آس پاس ہوتی ہے۔ گویا ہمارا پیسہ قیمت کے لحاظ سے اتنا ہی رہا جتنا ایک سال قبل تھا۔

آج کا "انٹرسٹ" یا "سود" یا "بیاج" وہ نہیں ہے جو عرب میں "ربا" کے نام پر رائج تھا۔ جو زائد رقم، عرب میں "ربا" کے نام سے جانی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ ایک آدمی دوسرے سے ایک مدت کے لئے پیسے یا سامان یا جانور قرض لے جس پر شروع میں کوئی سود نہیں ہوتا تھا، لیکن جب مقروض مقررہ مدت میں قرض نہ لوٹا سکے تو قرضہ دینے والا اس کو مزید مہلت اس شرط پر دیتا تھا کہ اصل رقم کے علاوہ قرضدار مزید کچھ رقم یا سامان یا جانور ادا کرے گا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ کوئی جنس جیسے آٹا یا کھجور قرضے پر لی جائے اور کچھ عرصے کے بعد اسی جنس میں کچھ اضافہ کر کے اسے واپس کیا جائے۔ متعینہ حالات میں یہ صورت بھی منع کی گئی ہے۔ مختصراً یہی وہ "ربا" ہے جسے منع کیا گیا ہے۔ ہم نے "ربا" کا ترجمہ "سود" یا "بیاج" کر کے اپنے لئے بلاوجہ مصیبت کھڑی کر لی ہے۔

اس مسئلے کے بارے میں، میں نے سنہ ۱۹۹۹ میں علامہ اقبال سہیل کی کتاب "حقیقۃ الربا" کو اردو، انگریزی اور عربی میں شائع کیا تھا اور اس کی کاپیاں ملک کے اندر اور باہر کے علماء اور مفتیان کو بھیجی تھیں۔ آج تک اس کتاب کا کوئی جواب میرے سامنے نہیں آیا ہے، البتہ شام کے مفتی اعظم شیخ احمد کفتارو نے ضرور جواب دے کر میرا شکریہ ادا کیا تھا کہ تم نے بڑی خدمت انجام دی ہے۔

''سود'' ایک بڑا مسئلہ ہے جس کی وجہ سے مسلم معاشرہ بہت سے مسائل میں گھرا ہے اور آگے نہیں بڑھ پا رہا ہے کیونکہ ہم نے راستے بند کر دئے ہیں اور کوئی متبادل نہیں فراہم کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہمارے کچھ علماء نے انشورنس کو بھی حرام قرار دے رکھا ہے جس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کو فسادات اور دوسری ناگہانی مصیبتوں میں نقصان کے بعد اپنے پاؤں پر دوبارہ کھڑے ہونے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔

تعلیم: تعلیمی طور سے ہندوستان کے مسلمان ملک میں دوسرے تمام گروپوں سے پیچھے ہیں۔ ہمارا ۴۰-۴۵٪ فیصد معاشرہ ناخواندہ ہے۔ اسکول چھوڑنے (ڈراپ آؤٹ) والے بچوں کا تناسب ہمارے یہاں سب سے زیادہ ہے جبکہ ہمارا دین روز اول سے علم حاصل کرنے کی ہمیں تلقین کر رہا ہے۔ علم میں یقیناً دینی علوم شامل ہیں لیکن دوسرے دنیاوی علوم بھی اسی طرح اہم ہیں۔ جب اللہ کے رسول ﷺ نے ہم سے کہا کہ ''علم حاصل کرو چاہے چین میں ہی کیوں نہ ہو'' تو اس کا مطلب دینی علوم تو نہیں تھے۔ ہمارا فرض ہے کہ زمانے اور حالات کے لحاظ سے جو علوم بھی مطلوب ہیں ان کو سیکھیں اور ان میں امتیاز حاصل کریں۔ ہمارے قدیم مدارس میں دینی علوم اور دنیاوی علوم کی تفریق نہیں تھی بلکہ وہیں سے مفسر اور عالم حدیث پیدا ہوتے تھے اور اُنھیں مدرسوں سے ریاضیات، فلک اور طب کے ماہرین بھی نکلتے تھے۔ مغربی سامراج کے آنے کے بعد یہ سلسلہ ٹوٹا اور مسلمانوں نے ایسے پرائیویٹ مدرسے بنانے شروع کر دئے جہاں دینی کیا بلکہ صرف مسلکی تعلیم دی جاتی ہے۔ یہ سلسلہ اس بنیاد پر شروع کیا گیا تھا کہ کہیں سرکاری مدارس کے ذریعے سامراجی حکمران ہمارے دین میں بھی دخل اندازی نہ شروع کر دیں۔ وقت گذرنے کے ساتھ یہ پرائیویٹ مدرسے اور ان کا نظامِ تعلیم مقدس ہو گئے۔ اب ان میں کسی تبدیلی کی بات کی جاتی ہے تو دین خطرے میں پڑ جاتا ہے جبکہ ان مدارس عربیہ کی ابتدا ۱۸۵۷ء کے بعد ہوئی۔

سچر کمیٹی کے مطابق ہندوستان میں تقریباً ۳۳٫ ہزار مدرسے ہیں لیکن ہمارا ذاتی خیال ہے کہ پرائیویٹ مدارس کی تعداد کئی لاکھ ہے۔ یہ مدارس ابتدائی، متوسط، ثانوی اور عالمیت وفضیلت کے درجات تک کے ہیں۔ سچر رپورٹ (۲۰۰۶) کے مطابق مدرسوں میں تقریباً ۳-۴ فیصد مسلم بچے پڑھتے ہیں لیکن میرے خیال میں ان میں ہمارے تقریباً ۱۰٪ فیصد بچے پڑھتے ہوں گے۔ ۸، ۱۰ اور ۱۲ سال گذارنے کے بعد جب یہ طلبہ مدارس سے باہر نکلتے ہیں تو وہ اس دنیا کے لائق نہیں رہتے

ہیں بلکہ صحیح معنوں میں ان کو دینی علوم اور عربی زبان پر بھی پوری دسترس نہیں ہوتی ہے۔ وہ جدید عربی لکھنے اور بولنے پر قادر نہیں ہوتے ہیں۔

مدارس کے نصاب کی اصلاح کی باتیں تقریباً ایک صدی سے چل رہی ہیں لیکن عملاً کوئی اصلاح بہت کم اور بہت دیر میں آتی ہے۔ ضرورت یہ تھی کہ یہ مدارس دینی اور عصری دونوں تعلیم دیتے اور ان سے نکلنے والا نوجوان ہائی اسکول اور سینئر سیکنڈری اسکول کے سرٹیفکٹ لے کر باہر نکلتا۔ آج یہ نوجوان جو سند لے کر مدرسے سے نکلتا ہے اس کی دنیا میں کوئی قیمت نہیں، وہ صرف امام، مؤذن یا کسی پرائیویٹ مدرسے میں تدریس کے لائق ہوتا ہے۔ اگر وہ زیادہ تیز و طرار ہوتا ہے تو ایک اور مدرسہ کھول لیتا ہے۔ چند سو فارغین مدارس بعض ہندوستانی یونیورسٹیوں میں داخلے لے کر انسانیات کے کچھ کورس کر لیتے ہیں یا ان میں سے دس، بیس بعض عرب یونیورسٹیوں میں داخلے پا جاتے ہیں۔ لیکن ان فارغین مدارس کی اکثریت عظمی حاشیے پر زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے۔

ہم نے کئی سال قبل جامعہ ازہر کے اسکولوں (معاہد ازہریہ) کے طرز پر ہندوستان میں مدارس کا نصاب بنانے کی تجویز رکھی تھی لیکن کسی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ جامعہ ازہر کے اسکولوں میں ایسی جدید و قدیم تعلیم ہوتی ہے کہ میٹرک کرنے بعد بچہ کسی بھی اسٹریم میں جاسکتا ہے۔ ہندوستان کا ایک مدرسہ خود کو ''ازہر ہند'' کہتا ہے لیکن اصلی ازہر جو مصر میں ہے، جہاں میں نے بھی تعلیم حاصل کی ہے، یہاں کے مدارس سے بہت مختلف ہے۔ ایک تعلیمی ادارے کے طور سے جامع ازھر ہزار سال قبل ایک مسجد سے شروع ہوا تھا لیکن زمانے کے لحاظ سے وہ خود کو بدلتا گیا۔ آج وہ ایک بین الاقوامی معیار کی یونیورسٹی ہے جس کے شہر نما کیمپس میں ہر علم و فن کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس کی اسناد دنیا کی ہر یونیورسٹی میں قبول کی جاتی ہیں جبکہ ہمارے بعض مدارس کی سندیں سوائے چند ہندوستانی اور کچھ عرب جامعات کے کہیں منظور نہیں ہیں اور وہ بھی صرف کچھ کورسیز کے لئے۔ بعض ہندوستانی یونیورسٹیوں نے کچھ متعینہ مدارس کی اسناد کو صرف کچھ کورسیز میں داخلے کے لئے منظور کیا ہے لیکن لگ رہا ہے کہ نئی داخلہ پالیسی کے تحت غالباً یہ سہولیت بھی ختم ہو جائے گی کیونکہ یونیورسٹیوں میں داخلے کے لئے اب کامن یونیورسٹی انٹرنس ٹسٹ (CUET) لازم ہونے جارہا ہے جس کے لئے سینئر سیکنڈری اسکول کا سرٹیفیکیٹ لازمی ہوگا۔ سنہ ۲۰۲۲ سے ۴۲؍ یونیورسٹیوں میں یہ ٹسٹ لازمی کر دیا گیا ہے اور دھیرے دھیرے تمام یونیورسٹیوں میں اسے لازمی کر دیا جائے

گا۔ مدارس کے فارغین اس ٹسٹ میں شریک ہی نہیں ہوسکیں گے کیونکہ ان کی اسناد منظور شدہ نہیں ہیں اور وہ درخواست ہی نہیں دے پائیں گے۔ اس خطرناک صورت حال کی ارباب مدارس کو خبر ہی نہیں بلکہ شاید ان کو اس سے خوشی ہوگی کہ اب ان کے طلبہ یونیورسٹیوں میں نہیں جاپائیں گے۔

یو پی اے سرکار نے مدرسہ مرکزی بورڈ بنانے کی تجویز رکھی تھی لیکن بعض بڑے مدارس کی مخالفت کی وجہ سے حکومت پیچھے ہٹ گئی اور اب کوئی اس کی بات نہیں کر رہا ہے۔ میرے خیال میں اب بھی ضرورت ہے کہ حکومت اس طرح کا مرکزی بورڈ بنائے تاکہ مدارس کی اسناد کو سرکاری حیثیت مل سکے۔ جس مدرسے کو اس نظام میں شمولیت سے پریشانی ہو وہ اس سے دور رہے لیکن باقی مدارس کو محروم نہ کرے۔

اسی کے ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے عصری اسکولوں کی حالت بھی بالعموم اچھی نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف نے تقریباً ہر شہر اور ہر قصبے میں اسلامیہ اسکول یا اسی طرح کے کسی نام سے موسوم اسکول قائم کیے تھے۔ کہنے کو تو یہ اسکول آج بھی موجود ہیں اور شہروں میں بہت عمدہ جگہوں پر واقع ہیں لیکن مقامی لوگ وہاں اتنی سیاست بازی کرتے ہیں کہ نہ ایسے اسکولوں کا نظام ٹھیک ہے اور نہ ان میں اچھی تعلیم ہوتی ہے، جس کی وجہ سے مسلمان بچوں کو اچھی تعلیم نہیں ملتی ہے یا وہ دوسرے اسکولوں میں جانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ہمارے بچوں کو زیادہ فیس دینے کے ساتھ طعنے بھی سننے کو ملتے ہیں اور کرناٹک میں حجاب جیسے مسائل سے بھی جوجھنا پڑتا ہے۔

اردو کے لئے ہم بہت روتے ہیں لیکن ہم اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتے ہیں۔ اگر ہماری نئی نسل اردو نہیں پڑھے گی تو اردو کیسے باقی رہے گی؟ اسرائیل میں یہودیوں نے عبرانی زبان کو، جو دو ہزار سال سے مردہ تھی، زندہ کر دیا اور وہ آج ایک بہت ترقی یافتہ زبان ہے۔ اور ہم ہیں کہ ایک زندہ زبان کی بھی حفاظت نہیں کر پا رہے ہیں۔ اپنے بچوں کو اردو پڑھائے بغیر، اس کو استعمال کئے بغیر، اردو اخبارات اور کتابیں خریدے بغیر، یہ زبان کس طرح باقی رہے گی؟ جو کام ہم خود کر سکتے ہیں وہ نہیں کرتے ہیں اور بس دوسروں کو کوستے ہیں کہ انھوں نے اردو ختم کر دی۔ اگر ہم اردو سے کٹ گئے تو وہ عظیم ملی سرمایہ جو لاکھوں کتابوں میں محفوظ ہے، ہم اس سے محروم ہو جائیں گے اور یہ ناممکن ہے کہ ہم اس سرمائے کو کسی اور زبان میں منتقل کر پائیں گے۔ ہمیں اپنی شناخت اور ملی وجود کے لئے اردو کی حفاظت کرنی ہے۔

تنظیمیں: کہنے کو تو ہمارے یہاں ہزاروں مقامی سے لے کر قومی سطح کی ''آل انڈیا'' تنظیمیں ہیں لیکن ان میں آپس میں کوئی میل ملاپ اور تعاون نہیں ہے۔ مختلف پروگرام ہر تنظیم چلا رہی ہے، غریبوں اور طلبہ کی مدد کر رہی ہے لیکن بار بار درخواست کرنے پر بھی وہ نہیں بتاتے ہیں کہ وہ کس کس کی مدد کر رہے ہیں، جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض شاطر لوگ مختلف اداروں سے مدد حاصل کر لیتے ہیں اور حقدار محروم رہ جاتے ہیں۔ ہم نے ایک تجویز مختلف تنظیموں کو بھیجی کہ ایک مشترکہ ویب سائٹ ہونی چاہئے جس میں مختلف مدوں میں امداد پانے والوں کے نام اور ان کو دی جانے والی رقوم اپلوڈ کی جائیں تاکہ ایک ہی شخص کو کئی جگہ سے مدد نہ ملے۔ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ ہر تنظیم سمجھتی ہے کہ کام تو بس وہی کر رہی ہے۔ بعض شاطر لوگ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کی خوب تشہیر کرتے ہیں لیکن شاذونادر ہی کوئی تنظیم اپنے آڈیٹ شدہ اکاؤنٹس کو عام کرتی ہو یا اپنے ویب سائٹ پر ڈالتی ہو۔

سماجی مسائل: سماجی طور سے ہمارے خاندان بکھر رہے ہیں۔ اصل امور جیسے تعلیم اور کاروبار وغیرہ پر توجہ نہیں ہے۔ جو پیسے بھی ہیں ان کو غلط رسوم بالخصوص شادیوں پر بے تحاشہ خرچ کر کے اڑایا جارہا ہے بلکہ اس کی وجہ سے لوگ بری طرح مقروض ہو رہے ہیں اور آباء واجداد کی جائدادوں کو بلا وجہ دکھاوے کے لئے فروخت کر رہے ہیں۔ جن کے پاس ذرا سے پیسے ہیں وہ بار بار دکھاوے کے لئے حج اور عمرے کر رہے ہیں جبکہ یہاں، غرباء، مدارس اور یتیم خانے وغیرہ بہت بری حالت میں ہیں۔ صرف فیس نہ دے پانے کی وجہ سے لاکھوں لوگ اپنے بچوں کو ہر سال اسکولوں سے نکال لیتے ہیں۔

میراث کے معاملے میں ہم تقریباً پوری طرح شریعت کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ شاذونادر ہی شریعت کے مطابق میراث کی تقسیم ہو رہی ہو بلکہ طاقتور افراد اپنے کمزور رشتہ داروں کو ان کے شرعی حق سے محروم کر دیتے ہیں اور بالعموم ہماری عورتوں کو ان کا حق نہیں ملتا ہے۔ ایسی حالت میں ہم کیسے اللہ پاک کی رحمتوں کے مستحق بنیں گے؟

اوقاف کی زمینیں اور جائدادیں ہمارے آباء واجداد نے بہت سے فلاحی کاموں اور مقاصد کے لئے وقف کی تھیں لیکن آج ان پر زیادہ تر قبضہ ہو چکا ہے اور قبضہ کرنے والوں میں مسلمان سب سے آگے ہیں۔ جو بچ گیا تھا اب اس پر حکومت کی نظر ہے۔

مسلم محلوں میں شراب، جوا، سود وغیرہ کا ارتکاب اب کھلے عام ہو رہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اچھے اور دیندار لوگوں کو اس کی پرواہ نہیں کہ ان کے پڑوس میں کیا ہو رہا ہے۔ ضرورت تھی کہ مقامی سماج سدھار کمیٹیاں بنتیں اور ایسے جرائم کا سدّباب خود کیا جاتا لیکن لگتا ہے کہ ہم بہت بے حس ہو چکے ہیں۔ ان فضول خرچیوں اور سماجی برائیوں کے بارے میں ہمارے علماء بھی کم نہیں کستے۔ وہ انھیں شادیوں اور لایعنی تقریبوں میں نظر آتے ہیں جس کے بارے میں وہ معاشرے کو اپنی تقریروں اور تحریروں میں خبردار کرتے ہیں۔

سماجی برائیوں میں ذات پات کا مسئلہ بھی ہے جو ہمارے اندر مقامی اثرات کی وجہ سے سرایت کر گیا ہے اور ہمارے معاشرے کو دیمک کی طرح کھا رہا ہے۔ اسلام میں ذات پات کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام تو ہم کو بتاتا ہے کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں اور سارے انسان برابر ہیں کیونکہ سب آدم کی اولاد ہیں۔ ہمارے رسول ﷺ نے فرمایا تھا کہ ”کسی عربی کو کسی عجمی پر برتری نہیں ہے سوائے تقوی سے“۔

سماج کے مسائل میں صحت کے امور سے غفلت اور مضر مرغن غذائیں کھانا بھی شامل ہے جو ہمارے ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ ان مضر غذاؤں کی وجہ سے ہمارے معاشرے کے اکثر لوگ طرح طرح کی بیماریوں کا شکار ہیں اور اسپتالوں میں پیسے لٹاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی صحت کا کچھ خیال کریں اور غلط قسم کی مرغن اور مصالحہ دار غذاؤں سے پرہیز کریں، ہلکی ورزش کریں، صبح یا شام کچھ دیر پیدل چلنے کو روٹین بنالیں تو ہم بہت سے امراض سے محفوظ رہ سکتے ہیں اور اپنے پیسے بھی بچا سکتے ہیں۔

ہم پرسنل لا کی حفاظت کی تو بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن ہماری آپس کی لڑائیاں محلہ سدھار کمیٹیوں یا دارالقضا میں حل نہیں کی جاتی ہیں بلکہ ہم ان کو عدالتوں میں لے جا کر جھوٹی شان کے لئے لاکھوں روپئے وکیلوں کو دے کر خود کو برباد کرتے ہیں۔

اخلاقی گراوٹ: میرے نزدیک ہمارے سارے مسائل میں سرِفہرست ہماری اخلاقی تنزلی کا مسئلہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عمدہ اخلاق کے حامل لوگ آج بھی ہماری سوسائٹی میں نظر آتے ہیں لیکن عموماً ہماری اخلاقی حالت تنزلی کی طرف گامزن ہے۔ آج ہماری عمومی حالت یہ ہے کہ دیگر اقوام کی بہ نسبت ہم میں اخلاقی ابتری زیادہ ہے۔ جھوٹ بولنا، امانت میں خیانت کرنا، وعدہ خلافی کرنا ہمارا وطیرہ بن چکا ہے۔ اور یہی وہ صفات ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا کہ

اگر ان میں سے کوئی ایک خصلت بھی کسی آدمی کے اندر ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے اور اگر یہ تینوں خصلتیں کسی انسان میں پائی جائیں تو وہ پورا منافق ہے۔ یہ گویا ایک معیار ہے جس سے ہم ناپ سکتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں یا نہیں ہیں۔ ہمارے لئے یہ بہت تشویش کا مقام ہے کہ ہماری کثیر آبادی میں یہ تینوں بری خصلتیں موجود ہیں جن کے بارے میں رسول اکرم ﷺ نے پندرہ سو سال قبل وارننگ دے دی تھی کہ جن میں یہ خصلتیں ہوں وہ منافق ہے اور یہ ہم جانتے ہیں کہ منافق کا آخری مقام جہنم ہے۔

یہ مسئلہ ہمارے لئے سر فہرست ہونا چاہئے کہ کس طرح مسلمانوں کی اخلاقی ابتری کو سدھارا جائے اور ان کو اللہ پاک سے ڈرنے والے بندے بنایا جائے جو بڑے سے بڑے دنیاوی فائدے کے لئے بھی نہ جھوٹ بولتے ہوں، نہ وعدہ خلافی کرتے ہوں اور نہ امانت میں خیانت کرتے ہوں۔

اس اخلاقی ابتری کی ایک بڑی وجہ ہمارا کلام اللہ یعنی قرآن پاک سے دور ہونا ہے۔ ہماری نمازیں اور روزے ایک بے روح عادت بن چکی ہیں۔ آج اکثر مسلمان قرآن پاک نماز میں یا ثواب کے لئے بغیر سمجھے ہوئے پڑھتے ہیں لیکن اُس ابدی ہدایت کے لئے نہیں پڑھتے ہیں جس کے لئے ہمارے اکثر لوگوں کو قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنا چاہئے جو ہماری تقریباً تمام زبانوں میں میسر ہے۔ قرآن پاک کے ذریعے اللہ پاک ہم سب سے ذاتی طور پر مخاطب ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم اللہ کا پیغام اللہ کی کتاب سے نہیں بلکہ کچھ مولویوں سے حاصل کرتے ہیں جو کلام اللہ کے بجائے دین کو بعض فقہی کتابوں سے حاصل کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کی جرأت تو اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ وہ عوام کو قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے سے ہی منع کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں عوام اس سے گمراہ ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک زندہ کلام کو چھوڑ کر ہم کچھ مولویوں کی خودساختہ آراء کو سنتے ہیں اور ان سارے تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کو ان کے مسلکی مدرسوں میں رٹائے جاتے ہیں۔

اسی مسئلے کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ہم نے اپنی مسجدوں کو صرف عبادت کے لئے مخصوص کر دیا ہے جبکہ مسجدیں ہماری قوم کا مرکز ہیں اور حضور پاک ﷺ اور خلفاء راشدین کے دور میں ایسے ہی تھیں۔ یہاں ہماری میٹنگیں ہونی چاہئیں، شادی بیاہ ہونا چاہئے، بچوں کی تدریس و تربیت ہونی چاہئے، محلہ سدھار کمیٹیوں کی میٹنگ اور کانفرنسیں یہیں ہونی چاہئیں۔ لیکن آج ایسا نہیں

ہورہا ہے بلکہ نماز کے فوراً بعد مساجد کے دروازوں پر تالے ڈال دئے جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہم نے مسجدوں کو مسلکوں میں بانٹ لیا ہے، دوسروں کو "اپنی" مسجدوں میں آنے نہیں دیتے ہیں، اگر آگئے تو ان کو برا بھلا کہتے ہیں بلکہ ان پر حملہ بھی کر دیتے ہیں۔ جبکہ اللہ پاک نے کہا ہے کہ "مسجدیں اللہ کی ہیں" (المساجد للہ)۔ اسی مسئلے کا ایک اور حصہ یہ ہے کہ ہم نے عربی میں خطبے پر اصرار کر کے اس عظیم ہفتہ وار تدریسی و تربیتی موقعے کو ضائع اور معطل کر دیا ہے۔ خطبۂ جمعہ ہر ہفتے عوام کی تلقین و تربیت کے لئے تھا لیکن عربی خطبے پر اصرار کر کے ہم نے اس کی افادیت معطل کر دی ہے۔

اگر ہم کو اپنی اور اپنی آنے والی نسلوں کے بارے میں کچھ فکر ہے، اگر ہم قوم و ملک کی بھلائی چاہتے ہیں تو ہمیں ان باتوں پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا اور اپنی اصلاح کا سنجیدہ پروگرام بنانا ہوگا۔[1]

دارالمصنّفین کا لائف ممبر بنئے

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی ملت اسلامیہ کا ایک بے نظیر علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ اس نے سیرت نبویؐ اور مختلف علوم و فنون پر بیش بہا لٹریچر فراہم کیا ہے۔ پچھلی ایک صدی کے دوران دارالمصنفین نے اب تک پونے تین سو کے قریب تصنیفات و تالیفات ملک کے سنجیدہ علمی حلقوں میں پیش کی ہیں۔ ادارے کا ماہنامہ ترجمان علمی "معارف" ملک و ملت کی ذہنی و فکری بیداری میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے۔ دارالمصنفین کی بقا اور ترقی ملت اسلامیہ کے مصالح علیا میں شامل ہے۔ دارالمصنفین کے مشن سے جڑنے کا ایک طریقہ لائف ممبری قبول کرنا ہے۔ لائف ممبر شپ کی فیس پچاس ہزار روپے ہے۔ ہر لائف ممبر کو سیرۃ النبیؐ کی سات جلدوں کا سٹ پیش کیا جاتا ہے نیز رسالہ "معارف" بھی تا حیات جاری کیا جائے گا۔ دارالمصنفین کے حیاتی رکن بن کر اس تہذیبی مشن میں شامل ہوں۔

Darul Musannefin Shibli Academy

Shibli Road, Azamgarh 276001, U.P.

Contact: +91-81279-45267 (office). **Email:** info@shibliacademy.org
A/C Name: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH.
A/C No: 0504010100032752. **Bank Name:** PUNJAB NATIONAL BANK.
Branch: HEERPATTI - AZMAGARH (U.P.). **IFSC:** PUNB 0476100.
Bank Code: 476100

[1] یہ امپار لیڈرشپ کانفرنس منعقدہ دہلی ۲/ اپریل ۲۰۲۲ میں دیا گیا خطبہ ہے جس میں کچھ نظر ثانی کر لی گئی ہے۔

وفیات

جناب عالم بدیع اعظمی مرحوم

کلیم صفات اصلاحی

اعظم گڑھ بلکہ پورے ہندوستان کی سنجیدہ سیاست کے ایک ایماندار، پاک دامن اور مقبول لیڈر رکن اسمبلی عالم بدیع اعظمی ۲۲/ جولائی ۲۰۲۶ء کو وفات پاگئے۔ وہ کیا گئے کہ اتر پردیش کی سیاست کو سوگوار کر گئے۔ ان کی شخصیت کی کشش کے مختلف پہلوؤں میں سب سے نمایاں پہلو موجودہ فرقہ وارانہ سیاسی ماحول میں بھی اپنی مسلم شناخت کو باقی رکھتے ہوئے برادران وطن میں حسن قبول کا حاصل ہونا ہے۔ مرحوم علم و فن کے شیدا اور مطالعہ و کتب بینی کے دلدادہ تھے۔ سیاسی امور و مسائل اور غیر علمی مشاغل میں شب و روز مصروف ہونے کے باوجود کتابوں کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ انہوں نے ہندوستان کی علمی، تعلیمی، ملی، قومی، ثقافتی اور سیاسی تاریخ کا جس کشادہ ذہنی اور گہرائی سے مطالعہ کیا تھا وہ ان کے معاصر سیاسی رہنماؤں میں بہت کم کسی کے حصے میں آیا۔ ان کے مطالعے کا دائرہ سیاسیات سے لے کر ادب اسلامی اور دینی موضوعات تک وسیع تھا۔ قرآن کی تلاوت کے ساتھ ساتھ اس کے مفاہیم و معانی کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خطابت کا ان کا خاص انداز تھا۔ سیاسی اور تعلیمی جلسوں میں بڑی مرتب، ادبی اور دلنشین گفتگو کرتے تھے۔ ایوان اسمبلی میں جب بولتے تو لوگ توجہ سے سنتے تھے۔ ان کے سیاسی خطابات و بیانات میں تجزیہ نگاروں کی نگاہِ جستجو کو کبھی کوئی جملہ یا لفظ ایسا نہیں مل پاتا تھا جس سے انہیں ہندو مسلم منافرت یا تنازعہ کا مواد ہاتھ آئے۔ اس سے ان کی مدبرانہ حکمت و مصلحت کا پتہ چلتا ہے جس کی آج کے ماحول میں سخت ضرورت ہے۔ انہوں نے اپنے پیچھے سادگی و سادہ مزاجی، بے نفسی و استغناء، نام و نمود اور ریا و نمائش سے اجتناب، افسروں کے سامنے بے خوفی و بے جگری، قومی و ملی مسائل سے دلچسپی اور مسلمانوں کو بیدار کرنے کی جو مثال پیش کی ہے وہ موجودہ لیڈروں بالخصوص سیاست سے دلچسپی رکھنے والے مسلم نوجوانوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ یوپی اسمبلی میں اردو میں حلف برداری پر اصرار کا واقعہ آج بھی لوگوں کو یاد اور ان کی اولوالعزمی اور حق پر ان کی ثابت قدمی کی یاد دلاتا ہے۔

وہ علامہ شبلی نعمانی کے ہم وطن تھے۔ گھر کا ماحول علمی و ادبی تھا۔ مرحوم کی پیدائش بندول میں ۱۶ مارچ ۱۹۳۶ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے گورکھپور چلے گئے جہاں ان کے

والد بدیع الزماں صاحب جارج اسلامیہ انٹر کالج میں شمع علم فروزاں کیے ہوئے تھے۔ ان ہی کے زیر نگرانی ۱۹۵۳ء میں انہوں نے اسی کالج سے انٹر میڈیٹ کیا۔ ۱۹۵۶ء میں ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ گورکھپور سے الیکٹریکل اینڈ میکینکل انجینئرنگ میں ڈپلوما کیا۔ اس کے بعد سول انجینئر کے منصب پر فائز ہوئے۔ لیکن سرکاری ملازمت سے جلد ہی مستعفی ہو کر اعظم گڑھ شہر کے محلہ معتبر گنج میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور بچوں کی پرورش و پرداخت کے لیے تلاش معاش میں لگ گئے۔ پھر مسلم مجلس کے بانی ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی مرحوم کے رابطے میں آئے اور ان ہی کی رہنمائی میں سیاست کا گر سیکھا۔ اسی پارٹی سے اعظم گڑھ صدر حلقے سے پارلیمانی الیکشن میں قسمت آزمائی کی اور چوتھے نمبر پر رہے۔ اس الیکشن سے انہیں اندازہ ہو گیا کہ اعظم گڑھ میں مسلم مجلس کمزور ہے، اس لیے انہیں دوسرے مؤثر سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ۱۹۹۲ء میں سماج وادی پارٹی کے لیڈر آنجہانی ملائم سنگھ کے رابطے میں آئے اور ۱۹۹۶ء میں پہلی بار ان کی پارٹی کے ٹکٹ پر نظام آباد سے رکن اسمبلی منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۲۰۰۷ء کے اسمبلی الیکشن کو چھوڑ کر نظام آباد اسمبلی حلقے سے پانچ بار ایم ایل اے منتخب ہوئے۔ ۲۰۲۲ء کے اسمبلی الیکشن میں جب کہ پورے یوپی میں بی جے پی کی لہر تھی ان کی سیٹ محفوظ رہی اور ۳۴ ہزار ووٹوں سے جیت کر نہ صرف ایک تاریخ بنائی بلکہ خود پارٹی میں ان کا سیاسی رعب و دبدبہ برقرار رہا۔ اس جیت سے ان کی ہر دلعزیزی اور کامیاب سیاست کا پتہ چلتا ہے۔ ایسے دور میں جب کہ ٹکٹ لینے، اس کے بعد الیکشن جیتنے کے لیے نہ جانے کیسے کیسے ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں عالم بدیع مرحوم کی واحد مثال ہے جنھوں نے اس کے لیے کبھی کوشش نہیں کی۔ انتخابی حلقے میں کام اور ان کی دیانت و ایمان داری کا ایسا چرچہ تھا کہ پارٹی کی طرف سے ان کو بلا کر ٹکٹ دیا جاتا تھا۔ انہوں نے الیکشن اور اس کی اشتہار بازی پر کبھی دولت نہیں لٹائی۔ پارٹی صدر ملائم سنگھ کے دل میں ان کی ایمان داری کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ پر تعیش سیاست سے ان کی بیزاری و دوری کا یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ انہوں نے کابینہ میں شامل ہونے کی ملائم سنگھ صاحب کی پیش کش یہ کہہ کر ٹھکرا دی تھی کہ ''نیتاجی! اگر میں وزیر بنا تو آپ کے وزیروں کے لیے بڑی مشکل پیدا ہو جائے گی۔ وزارتی ٹھاٹ باٹ میں رہ کر اپنے لوگوں سے الگ نظر آنے لگوں گا۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ جن کا میں خادم ہوں خود کو ان سے بڑا محسوس کراؤں''۔ ان کے سیاسی خیالات اور ملک و ملت کے لیے مخلصانہ جذبات سے جو واقف ہے وہ کہہ سکتا ہے کہ ان کی فکر و سوچ پر ایثار پیشہ اور ملک سے سچی محبت کرنے والے صف اول کے مجاہدین آزادی اور سیاسی رہنماؤں کے نظریات کا خاص اثر تھا۔

ان کی ولادت ایسے زمانے میں ہوئی جب ہندوستان برطانوی تسلط سے آزادی کی آخری منزل میں داخل ہو چکا تھا۔ آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے شعور کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ آزادی کے بعد ملک کے تمام خوش گوار و ناخوشگوار واقعات اور ہندوستان میں جمہوریت اور سیکولرزم کے ارتقاء اور اس کے بعد اس کے ہوش ربا انحطاط و تنزل کی داستان انہیں ورق در ورق یاد تھی۔ انہوں نے نہایت ہوشیاری سے ذاتی طور پر ان واقعات سے ہوش کے ناخن لیے تھے۔اسی وجہ سے ان کی سیاست میں ایک طرح کی مثبت اور متین سوچ کی جھلک زیادہ پائی جاتی ہے۔پیشے کے اعتبار سے وہ انجینئر تھے،اس لیے سیاست کے عملی تجربات کا جو تاروپود اور ادھیڑ بن ان کے یہاں نظر آتا ہے اوروں کے یہاں نہیں ملتا۔

مسلمانوں کو غیور، دین وسیاست دونوں میدانوں میں ممتاز اور صاحب عمل دیکھنا چاہتے تھے۔ عام بے راہ روی اور شغل بیزاری سے ان کو سخت نفور تھا۔ اسی لیے بسا اوقات وہ عوامی جلسوں اور خصوصی مجلسوں میں بھی کھری کھری سناتے تھے جس کے سبب کبھی کبھی لوگ ان سے شاکی بھی ہو جاتے تھے لیکن ان کی اس صدق گوئی اور آئینہ دکھانے کے پیچھے ان کے خیر خواہانہ جذبے پر جب لوگوں کی نگاہ جاتی تو بہت جلد حرف شکایت، حرف غلط کی طرح مٹ جاتا تھا۔ مسلم تعلیمی اداروں کے سالانہ جلسوں میں جاتے تو طلبہ و طالبات کے اندر حوصلہ پیدا کرنے کے مقصد سے اسلاف کے شاندار کارناموں کا تذکرہ ضرور کرتے تھے۔پڑھے لکھے مسلمانوں بالخصوص مصنّفین اور صحافیوں کے لئے دل میں بہت قدر تھی۔ انہیں گاہے بہ گاہے اعزاز و اکرام سے نوازتے تھے تاکہ یہ جماعت جس کے اوپر مسلمانوں کی صحیح علمی و فکری رہنمائی اور ان کی ذہن سازی کی ذمہ داری ہے، باقی رہے۔ قدرافزائی و علم دوستی کی اس قسم کی مثالیں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔ علامہ شبلی کی یادگار دارالمصنّفین تو ان کو دل سے عزیز تھا۔ آئے دن تشریف لاتے۔ یہاں کے لوگوں سے باتیں کرتے۔ ان کی علمی مصروفیات کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے۔ ادارے کی مطبوعات پر جان چھڑکتے تھے۔ سیرۃ النبیؐ، الفاروق، الغزالی، المامون، سیرت عائشہ، سیر الصحابہ اور سلسلۂ تاریخ ہند ان کے مطالعے میں تھا۔ معارف کے شذرات اور تبصروں کو پہلی فرصت میں پڑھتے تھے۔ ۲۰۱۴ء میں شبلی صدی تقریبات کے موقع پر ادارے کو ان کا بھی تعاون حاصل رہا۔ البتہ اپنے بعد عوام کے لیے انہوں نے مثبت سیاسی فکر کے سوا کوئی ایسی علمی، تعلیمی یا ثقافتی یادگار نہیں چھوڑی جس کا فیضان ان کے بعد بھی جاری رہتا۔ مرحوم کی طویل سیاسی زندگی کا یہ خلا بھی تعجب انگیز ہے۔

تبصرۂ کتب

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، قرآن مجید اور بائبل میں پیغمبروں کا کردار: ایک موازنہ، جمع و ترتیب: رفیق احمد رئیس سلفی، خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ۲۰۲۶، صفحات: ۴۵۶، قیمت: ۷۰۰ روپئے۔

مستشرقین اور ان کی اتباع میں کچھ دوسرے اسکالر صدیوں سے دعوی کر رہے ہیں کہ قرآن پاک بائبل (عہد قدیم و جدید) کا چربہ ہے۔ انھوں نے نبی اسلام ﷺ کے سفر شام اور مکہ میں ایک دو عیسائی غلاموں کے ساتھ ملاقاتوں سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ انہی لوگوں سے کچھ سیکھ کر حضور پاکؐ نے اسلام کی بنیاد رکھی۔ اولاً تو یہ مکمل طور پر ایک لایعنی مفروضہ ہے کہ شام دو ایک بار تجارتی سفر کرنے کے دوران کسی راہب سے ملاقات یا مکہ میں ایک دو معمولی عیسائی غلاموں سے بات چیت پر ایک عظیم اور مکمل ترین مذہب کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ نبوت سے پہلے سے نبی اسلامؐ کی زندگی کے واقعات مدوّن ہیں اور نبوت کے بعد تو گویا ان کے شب و روز کی مکمل ڈائری احادیث اور سیرت نبویہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ خاصیت قدیم تو کیا موجودہ زمانے میں بھی کسی لیڈر یا مفکر کو حاصل نہیں۔ حضور پاکؐ کے تیس ہزار سے زیادہ ساتھیوں کی زندگیوں کے بارے میں بھی مفصل حالات ''رجال'' کی مستند کتابوں کی صورت میں ہم کو حاصل ہیں۔ اس مفصل رجسٹر میں یہ بات کہیں مذکور نہیں ہے کہ حضور پاکؐ نے عیسائیوں یا یہودیوں سے کچھ سیکھ کر اسے اپنایا ہو بلکہ اسلام ۲۳ سال کے عرصے میں دھیرے دھیرے وحی سماوی کی روشنی میں متشکل ہوا۔

مستشرقین اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں نے دعوے تو خوب کیے مگر اپنے خود ساختہ نظریات کو ثابت کرنے کے لیے ٹھوس دلیلیں نہیں دیں۔ ان کے دعوؤں کو غلط ثابت کرنے کے لیے یہی کافی تھا کہ بائبل اور قرآن کا موازنہ کیا جاتا اور دکھایا جاتا کہ کس طرح قرآن عہد قدیم اور عہد جدید سے مختلف ہے۔ نہ صرف عہد قدیم کی سختی اور عہد جدید کی نرمی اسلام کے اعتدال سے واضح طور پر ٹکراتی ہے بلکہ بائبل اور قرآن کے مندرجات میں بھی بہت تباین ہے۔ جہاں آج ہمارے پاس عہد قدیم و جدید کا کوئی مستند اصل نسخہ موجود نہیں وہیں ہمارے ہاتھوں میں موجود قرآن پاک ہو بہو وہی کلام ہے جو حضور پاکؐ کو وحی کے ذریعے دیا گیا اور اسی زبان میں ہے جس میں وہ اصلاً نازل ہوا، جبکہ توریت، باعتراف علماء بنی اسرائیل، دو بار پوری طرح تباہ ہو گئی اور پھر

حافظے سے لکھی گئی۔ عہد قدیم کے کچھ حصے قدیم عبرانی زبان میں اور کچھ آرامی زبان میں لکھے گئے اور یہ دونوں زبانیں آج ناپید ہیں، جبکہ عہد جدید کی کتابیں (اسفار) بھی "کوینی یونانی" زبان میں لکھی گئی ہیں اور یہ دونوں کتابیں بھی آج اصل کے بجائے دوسری زبانوں میں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں۔

سنجیدہ مطالعہ بتاتا ہے کہ بائبل اور قرآن پاک کے مندرجات میں بہت فرق ہے۔ بائبل میں خدا اور انبیاء کے بارے میں ایسے مندرجات ہیں جس کو کوئی بھی سلیم الطبع شخص قبول نہیں کر سکتا ہے، جبکہ قرآن پاک میں تمام انبیاء کی عظمت اور وقار کو برقرار رکھا گیا ہے اور اللہ پاک جل شانہ کی طرف کوئی ایسی بات منسوب نہیں ہے جس سے اس کی شان الوہیت پر کسی طرح کی ضرب پڑتی ہو، جبکہ بائبل میں بار بار انبیاء اور خدائے پاک کے بارے میں نازیبا الفاظ اور صفات استعمال کیے گئے ہیں۔ بائبل اور قرآن کے درمیان صرف یہی موازنہ مستشرقین کے دعوے کو باطل کرنے کے لیے کافی ہے۔ مسلم اسکالرز نے اس کی طرف اشارے تو کیے ہیں لیکن اس پر باقاعدہ ریسرچ نہیں کی۔ راقم الحروف نے اس کی طرف اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن پاک میں تفصیل سے اشارہ کیا ہے اور ایک مختصر تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے جو معارف (جون ۲۰۲۶) میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکا ہے۔

موجودہ کتاب کے مؤقر مصنف نے بھی قرآن اور عہد جدید میں حضرت مریمؑ کے کردار کا موازنہ کر کے دکھایا ہے کہ کس طرح قرآن پاک حضرت مریمؑ کی عظمت و وقار کا پوری طرح خیال رکھتا ہے جبکہ عہد جدید میں ایسا نہیں ہے بلکہ بعض اوقات ان کو ایک عام عورت سے زیادہ کا مقام نہیں دیا گیا ہے۔ یہ مقالہ بھی معارف (نومبر ۲۰۲۵) میں شائع ہو چکا ہے۔

موجودہ کتاب اسی کام کو آگے بڑھاتے ہوئے بائبل اور قرآن پاک میں مذکور انبیائے کرام علیہم السلام کے کردار کا موازنہ کرتی ہے کہ کس طرح دونوں کتابوں میں انبیاءؑ کی صورت گری میں بنیادی فرق ہے۔ قرآن پاک انبیاء کی عظمت و عصمت کا محافظ ہے جبکہ بائبل میں یہ ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے موجودہ کتاب اسلامی لٹریچر میں ایک بہت اہم اضافہ ہے۔ یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ بائبل کے مندرجات میں اللہ پاک کا وقار اور عصمت و عظمت انبیاء علیہم السلام بائبل میں مستقل تحریف کی وجہ سے متأثر ہوئی ہیں جبکہ قرآن پاک آج بھی بالکل وہی ہے جیسے وہ حضور پاکؐ پر نازل ہوا تھا۔ واضح رہے کہ موجودہ کتاب میں صرف پیغمبروں کی بائبل اور قرآن پاک میں صورت گری سے بحث کی گئی ہے جبکہ دوسرے اور بہت سے موضوعات ہیں، بالخصوص

عقائد اور تاریخی روایات، جن پر دونوں الہامی کتابوں کے درمیان موازنہ ہونا باقی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف، جو خود انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں، جلد ہی اس کو انگریزی میں بھی شائع کریں گے تاکہ مستشرقین اوران کے متبعین تک یہ تحقیق پہنچ سکے۔ اسی طرح ہمیں امید ہے کہ فاضل مصنف یا خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن میں بائبل اور قرآن پاک کے دوسرے عقائدی اور تاریخی مندرجات کا موازنہ کرکے مستشرقین کے اس جھوٹ کو ہمیشہ کے لیے دفن کردیں گے۔

کتاب کی اشاعت پر نہ صرف فاضل مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں بلکہ خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن بھی مبارکباد کا مستحق ہے۔ یہ مرکز فاضل مصنف کی قیادت میں بہت سنجیدہ علمی خدمت انجام دے رہا ہے جس کی مثال شاید پوری دنیا میں نہیں ہے۔ (ظفر الاسلام خان)

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، تراوشِ قلم، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۴۶۴، قیمت: ۵۰۰روپے، سن اشاعت: ۲۰۲۵ء، پتہ: مکتبہ نشانِ راہ، کے ۶، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵، اور لکھنؤ اور دہلی کے مشہور مکتبے۔ موبائل: ۹۸۹۹۵۴۵۵۴۶

قریب ساٹھ باسٹھ کتابوں کے فاضل مصنف کی اس کتاب میں دوسرے مصنفین کی علمی، ادبی اور مذہبی کتابوں پر لکھے گئے مقدموں کو جمع کیا گیا ہے، خود مصنف کی کچھ کتابوں کے مقدمے بھی ساتھ میں ہیں اور مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادی پر دو تحریریں بھی ہیں۔

مقدموں، تقریظوں یا تعارفی تحریروں کے لیے تراوش سے زیادہ مناسب اور خوبصورت لفظ ابر آسا قلم کے ترشحات کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے۔ فاضل مصنف، مقدمہ نگاری کے فن سے بخوبی آشنا ہیں، وہ کتاب کی روح سے ہم آہنگ ہو کر اس کے حسن و قبح اور کچھ نئے افادی اشاروں سے اصل کتاب سے براہ راست تعلق پیدا کرنے کی خوبی اور مہارت میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

ان کی عدالت علمی میں مقدمات ایک جیسے نہیں، اسلامیات، ادبیات اور شخصیات کے موضوعات کا تنوع، ان کے قلم کی تراوش کو اور پر لطف بنا دیتا ہے۔ قرآن کریم، سیرت نبویؐ، اسلام کی تاریخ، واقعات اور حوادث پر مشتمل کتابیں ہوں یا اقبال، احمد امین، کلیم عاجز، قدرت اللہ شہاب، ملک زادہ اور شمس الرحمٰن فاروقی کے تعلق سے ادبی نگارشات ہوں یا مشاہیر علماء کے سوانح ہوں، ان کی بوقلمونی میں ایک جوہر، ہر جگہ موجود نظر آتا ہے اور وہ ہے اسلوب کی دلکشی، نظر کی

دراکی اور فکر کی صفائی اور پاکیزگی۔ ادب و انشا کی گل کاریوں میں افکار کی جدت و معنویت کا حسن توازن اب مشکل ہی سے سامنے آتا ہے۔ فاضل مصنف کی تحریروں کی بڑی اور نمایاں خوبی یہی ہے کہ افکار کی معنویت، اظہار کی ادبیت کو کہیں بھی تنہا نہیں چھوڑتی۔ قرآن کریم کے ادبی اعجاز پر مولانا عبداللہ عباس ندوی کی کتاب پر اظہار خیال میں جب یہ جملہ قلم کی تراوش سے نہال ہو کر نکلتا ہے تو واقعی فکر و نظر کو تازہ کر جاتا ہے کہ "قرآن مجید میں، اللہ تعالیٰ کی متلو آیات ہیں لیکن یہ پوری کائنات غیر متلو آیت ہے"۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "قبول اسلام کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے۔ ایک داعی کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ کون سا اسلوب ہے جس سے دل متاثر ہوتے ہیں"۔ دل و دماغ کی ہم آہنگی کا احساس ہی ان کی یہ پہچان بناتا ہے کہ تحریریں جب تک دل کا تقاضا نہ بن جائیں، قلم سے نہیں نکلتیں۔ یہ احساس کہ جو لکھا جائے "تپاک جاں" سے لکھا جائے یہ اخلاص عمل کا اعلان ہے چاہے وہ احمد فراہی کے حوالے سے ہو۔ ایک جگہ لکھا کہ حضرت معاویہؓ نے تاریخ کے موضوع پر ایک کتاب مدون کرنے کا عزم کیا۔ اس صحابیانہ عزم کو انھوں نے "ثقافتی خدمت" سے تعبیر کر کے اپنے نظریہ کو پوشیدہ نہیں رکھا۔ بلکہ اس کا واضح اظہار حضرت شاہ آیت اللہ قادری زیب سجادہ خانقاہ مجیبیہ کی کتاب "خلافت و ملوکیت اور حضرت عمر بن عبدالعزیز" کے مقدمے میں کر دیا۔ لکھا کہ کسی شخص کو نبوت کی تربیت گاہ کا ایک ذرہ بھی نصیب ہو جائے تو اس کے دل میں اقتدار کی طلب، امارت کی ہوس اور جاہ پسندی نہیں پیدا ہو سکتی۔ یہ مقدمہ اپنے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے۔ جو قاری کو مجبور کرتا ہے کہ وہ کتاب کو اپنی فکر کی غذا بنا لے، اس کے لیے ان کے قلم کے جوش کی ایک لہر اس انداز سے اٹھی کہ "یہ وہ کتاب ہے جسے ہر تعلیم یافتہ شخص کو پڑھنا چاہیے، امیر ہو یا مامور، مالک ہو یا مزدور، سلطان ہو یا جمہور، خاقان ہو یا فغفور، یہ متاع علم و فن ہے، یہ حاصل ہزار مطالعہ ہے، یہ پوری تاریخ کا سب سے اہم حوالہ ہے۔۔۔" مقدمہ میں وکالت کا یہی پر جوش انداز مولانا عبدالرشید نعمانی کی کتاب 'حادثہ کربلا کا پس منظر' کے کلمات تقدیم میں نمایاں ہے۔ شہادت حضرت حسینؓ کی بحث میں ابن تیمیہ کے بعض اقوال کی تفہیم میں ان کا یہ ادبی اور تاریخی اسلوب بھی جوش و ہوش کی متضاد کیفیتوں کا عجیب امتزاج ہے کہ "ابن تیمیہ کے محاسن و کمالات، بے مثال حافظہ، خداداد جرأت، دین کے بارے میں ان کی غیرت و حمیت، تقویٰ، خشیت الٰہی سب کچھ مسلم ہے، ان کی زبان، ابر گوہر بار، ان کا قلم، تیغ اصیل، حاضر جوابی

بے نظیر لیکن جہاں تک میانہ روی اور مسلک کے توازن اور زبان و قلم کا تعلق ہے، اس بارے میں بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے"۔ اس بہت کچھ میں ان کے نزدیک یہ بھی شامل ہے کہ "ردشیعیت کے جوش میں اعتدال کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹا ہے"۔ اسی مقدمہ میں انہوں نے یزید کے دور کی "فاسقانہ ثقافت" کے بارے میں لکھا کہ تاریخ کی بے شمار کتابیں اس کی گواہ ہیں۔ غالباً یہ مقدمہ سب سے طویل ہے۔ اس لیے اس کو قلم کی تراوش کی جگہ، خیالات کے طوفان ابر و باد سے تعبیر کیا جانا چاہیے ۔ فاضل مصنف بہر حال آخر میں تلقین کرتے ہیں کہ جمہور اہل سنت کے موقف کی صحت پر یقین اور عشق کے آب حیات سے تخم دل کی آبیاری نہ صرف واقعہ کربلا کے غلط مطالعہ میں نفسیاتی مرض کا علاج ہے بلکہ یہ وہ نسخہ شفا ہے جس سے قلب و نظر کی بیماریوں کے بہت سے مریض شفایاب ہوسکتے ہیں۔ حقیقت نگاری سے زیادہ یہ عبارتیں، تاریخ میں انشائی ادب کی پر لطف آمیزش بن جاتی ہیں۔ پر لطف تو یوسف حسین خاں کی کتاب روح اقبال پر ان کی وہ تحریر ہے جس کے مطابق اقبال کا فلسفہ عروج و زوال، یوسف حسین خاں کی نثر میں آکر زیادہ آسان اور عام انسان کی دسترس میں آگیا، لیکن مضمون کے آخر میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ "روح اقبال بہت بھاری بھرکم کتاب ہے اور فکر اقبال کی ایسی شرح ہے جو خود ایک شرح کی متقاضی ہے تاکہ یہ ہر شخص کے لیے قابل فہم اور لائق ہضم بن سکے"۔ نثر میں شتر گربگی کی صنعت کا استعمال اگر فن پر دسترس کی دلیل ہے تو یہ عبارت اس کی مثال ہے۔

مقدموں پر مشتمل اس کتاب کا مقدمہ پروفیسر زبیر احمد فاروقی کے قلم سے ہے۔ انہوں نے فاضل مصنف کی فکر اور قلم کے کینوس کی وسعت اور ہمہ گیری کا بجاطور پر اعتراف کیا ہے کہ تاریخ اسلام و قرآن ہو یا شہاب نامہ اور کئی چاند تھے سر آسماں اور رقص شرر جیسی شہرت پائی ہوئی اور ادبیاتی شناخت رکھنے والی کتابیں ہوں، ان کے فنی مقام کے تعین میں بخل سے کام لیا گیا۔ اس مقدمہ کا عنوان بھی مضامین کے انتخاب کا بڑا خوبصورت ترجمان ہے یعنی دہکا ہوا ہے آتش گل سے چمن تمام۔ اس میں تراوش قلم کی خنکی اور نمی کا احساس تو منطقی ہے لیکن مقدمہ کا عنوان، صنعت تضاد کی شان بڑھادینے والا ہے۔ کتاب واقعی اپنی خوبیوں کی وجہ سے باربار مطالعہ میں آنے کا حق رکھتی ہے اور خود فاضل مصنف کی علمی و ادبی شان کے لائق ہے۔

(محمد عمیر الصدیق ندوی)

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی، قرآنِ کریم کے فیوض وبرکات اور اس پر عمل کے ثمرات، حلقۂ درس قرآن، اسلام منزل، اقرا کالونی، علی گڑھ - ۲۰۲۶، صفحات: ۸۰، قیمت: ہدیہ، مصنف کا ایمیل:

zafarul.islam@gmail.com

قرآنِ کریم کی امتیازی شان یہ ہے کہ وہ محض عبادات یا مذہبی رسوم تک محدود نہیں بلکہ انسان کی انفرادی، اجتماعی، اخلاقی، فکری اور تہذیبی زندگی کے ہر گوشے کو اپنے دائرہ ہدایت میں سمیٹتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں اہلِ علم نے قرآنِ کریم کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کیا اور اس کی تعلیمات کو اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق واضح کرنے کی کوشش کی۔ تفسیر، علومِ قرآن، اعجازِ قرآن، مقاصدِ قرآن اور قرآنی افکار پر لکھی جانے والی بے شمار تصانیف اسی علمی روایت کی نمائندہ ہیں۔ عصرِ حاضر میں، جب قرآنِ کریم سے عقیدت تو عام ہے، لیکن اس کے فہم، تدبر اور عملی رہنمائی سے استفادہ نسبتاً کم دکھائی دیتا ہے، ایسی کتابوں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے جو قاری کو قرآن کے ساتھ شعوری تعلق استوار کرنے کی دعوت دیں۔ خصوصاً وہ تصانیف جو فضائلِ قرآن کے بیان کو محض ترغیب تک محدود نہ رکھیں بلکہ اس کے عملی تقاضوں اور اصلاحِ زندگی کے پہلوؤں کو بھی نمایاں کریں۔ پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کی تازہ تصنیف ''قرآنِ کریم کے فیوض وبرکات اور اس پر عمل کے ثمرات'' اسی نوع کی ایک فکر انگیز کاوش ہے۔

حجم میں اختصار کے باوجود اس کی ترتیب، مواد اور موضوعاتی ربط اسے محض ایک مختصر کتابچہ نہیں رہنے دیتے بلکہ یہ قرآنِ کریم کے ساتھ زندہ تعلق کی دعوت دینے والی ایک منظم علمی و دعوتی تصنیف ہے۔ مصنف نے فضائلِ قرآن کے روایتی مباحث کو اس زاویے سے پیش کیا ہے کہ قاری کی توجہ مسلسل اس سوال کی طرف مبذول رہتی ہے کہ قرآن سے حقیقی فیض حاصل کرنے کا راستہ کیا ہے۔

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی کا نام برّ صغیر کے ان اہلِ علم میں نمایاں ہے جنھوں نے اپنی علمی زندگی کا بڑا حصہ قرآنِ کریم کے مطالعہ، تدبر اور اس کی تعلیمات کے فروغ کے لیے وقف کیا ہے۔ ان کی متعدد تصانیف، مثلاً قرآن مجید کا مقام و مرتبہ اور اس کے تقاضے، قرآن کریم کا تعارف قرآن کی زبانی، قرآنی افکار و تعلیمات اور موجودہ دور میں ان کی معنویت، قرآنی مطالعات، قرآنی دروس، قرآن کریم اور مالی معاملات، قرآن کریم اور اللہ کے بندوں کو نفع رسانی اور ذکرِ الٰہی اور دعا کے فیوض و برکات اس حقیقت کی شاہد ہیں کہ ان کی تصنیفی زندگی کا بنیادی محور قرآنِ کریم

اور اس کی عملی تعلیمات رہی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب اسی مبارک علمی سفر کا ایک فطری تسلسل ہے۔ تاہم اسے ان کی سابقہ تصانیف کا محض اعادہ قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ یہاں مصنف نے قرآنِ کریم کے فضائل کو زندگی کے عملی تقاضوں سے مربوط کر کے پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک قرآن کی برکت کا حقیقی مفہوم صرف اس کی تلاوت، حفظ یا ظاہری احترام میں نہیں بلکہ اس ہدایت کو شعوری طور پر قبول کر کے اپنی فکر، کردار اور طرزِ زندگی میں جگہ دینے میں مضمر ہے۔ یہی تصور کتاب کی فکری بنیاد ہے اور اس کے تمام مباحث کو ایک مرکزی ربط بھی عطا کرتا ہے۔

زیرِ نظر تصنیف ایک دعوتی اور اصلاحی نوعیت کی علمی کاوش ہے جس کا بنیادی مقصد قرآنِ کریم کے ساتھ شعوری، مضبوط اور عملی تعلق پیدا کرنا ہے۔ مصنف نے قرآن و حدیث کی روشنی میں نہ صرف قرآنِ کریم کے فضائل و برکات کو بیان کیا ہے بلکہ اس حقیقت کو بھی نمایاں کیا ہے کہ حقیقی فائدہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب قرآن کو زندگی کی رہنما کتاب بنا کر اس پر عمل کیا جائے۔

کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قرآنِ کریم کے نزول کو اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمانیت و رحیمیت کے عظیم مظہر کے طور پر بیان کیا گیا ہے جبکہ دوسرے باب میں احادیثِ نبویہ کی روشنی میں قرآنِ کریم کے فیوض و برکات اور اس پر عمل کے ثمرات کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یوں قرآن اور حدیث دونوں کے دلائل مل کر ایک ایسا مربوط تصور پیش کرتے ہیں جو قاری کو صرف معلومات ہی فراہم نہیں کرتا بلکہ اس کے دل میں قرآن سے تعلق مضبوط کرنے کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے۔ اسی تناظر میں مصنف نے قرآنِ کریم کے ان اوصاف پر روشنی ڈالی ہے جن کا ذکر خود قرآن میں آیا ہے جیسے نور، ہدایت، رحمت، برکت، موعظت اور شفا۔ ان اوصاف کو الگ الگ فضائل کے طور پر بیان کرنے کے بجائے ایک جامع تصور کے تحت پیش کیا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم کی ہر صفت انسان کی فکری، اخلاقی اور روحانی تعمیر سے وابستہ ہے۔ اس انداز سے قاری کو قرآن کے مقصدِ نزول کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اس باب کا ایک اہم پہلو قرآنِ کریم سے صحیح استفادے کے عملی تقاضوں کی وضاحت بھی ہے۔ مصنف نے علمِ قرآن، تلاوت، تدبر اور قرآنی تعلیمات پر عمل کی اہمیت کو متوازن انداز میں بیان کیا ہے جس سے کتاب محض فضائل کے بیان تک محدود نہیں رہتی بلکہ قاری کو عملی رہنمائی بھی فراہم کرتی ہے۔

کتاب کا دوسرا باب پہلے باب کی فکری تکمیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں پہلے باب میں

قرآنِ کریم کے مقام اور اوصاف کو بنیادی طور پر قرآنی آیات سے واضح کیا گیا تھا وہیں اس باب میں احادیثِ نبویہ کی روشنی میں انہی مضامین کی مزید تشریح اور عملی اہمیت بیان کی گئی ہے۔ اس ترتیب سے قرآن اور سنت کے باہمی تعلق اور ان کی وحدتِ ہدایت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ مصنف نے منتخب احادیث کے ذریعے قرآنِ کریم کی فضیلت، اہلِ قرآن کے مقام، تعلیم و تعلم، تلاوت، حفظِ قرآن اور اس سے وابستگی کے مختلف پہلوؤں کو منظم انداز میں پیش کیا ہے۔ روایات کی یہ ترتیب محض فضائل کے بیان تک محدود نہیں رہتی بلکہ قاری کو قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی دعوت دیتی ہے۔ اس باب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ قرآن سے وابستگی کو صرف انفرادی عبادت یا روحانی سکون کا ذریعہ نہیں بلکہ کردار سازی، فکری استقامت اور دینی شعور کی بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ اسی لیے کتاب کا دعوتی پہلو محض ترغیب تک محدود نہیں رہتا بلکہ عملی زندگی سے مضبوطی کے ساتھ مربوط ہو جاتا ہے۔ مصنف نے قرآن و حدیث کے دلائل کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ قرآن سے مضبوط وابستگی ہی فرد اور معاشرے کی دینی واخلاقی استقامت کی اساس ہے۔ اس پوری بحث میں جذباتی اسلوب کے بجائے متوازن استدلال اختیار کیا گیا ہے جس سے عبارت میں سنجیدگی اور اثر دونوں پیدا ہوئے ہیں۔ مجموعی طور پر دوسرا باب پہلے باب کی فکری بنیاد کو مضبوط کرتا ہے اور قرآن و سنت کی روشنی میں اس کے عملی تقاضوں کو واضح کرتا ہے۔ یہی ربط کتاب کی ترتیب کو منظم اور اس کے مرکزی پیغام کو موثر بناتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی ایک نمایاں خوبی اس کا متوازن اور عام فہم اسلوب ہے۔ پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی نے سادہ، شستہ اور رواں زبان اختیار کی ہے جس سے مختلف علمی پس منظر رکھنے والے قارئین بھی آسانی سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان کے استدلال کی بنیاد ذاتی آرا کے بجائے قرآن وحدیث کے نصوص پر ہے جس سے کتاب کی علمی اعتباریت مزید مضبوط ہو جاتی ہے۔ کتاب کی موضوعاتی تنظیم بھی قابلِ توجہ ہے۔ اگرچہ اس کا حجم مختصر ہے لیکن مباحث منطقی ترتیب کے ساتھ ایک مرکزی فکر کے گرد منظم ہیں۔ ہر عنوان سابقہ بحث سے مربوط ہے جس کے باعث پوری تصنیف ایک مستقل فکری تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔ اس کتاب کی انفرادیت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے فضائل کو محض اجر و ثواب کے بیان تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ انہیں دینی شعور، کردار سازی اور عملی زندگی سے جوڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ یہی پہلو اسے عام فضائلِ قرآن کی تصانیف

سے ممتاز کرتا ہے اور دعوتی واصلاحی ادب میں ایک اہم مقام عطا کرتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ تصنیف اپنے مقصد، ترتیب اور علمی توازن کے اعتبار سے ایک کامیاب کاوش ہے۔ مصنف نے غیر ضروری طوالت، اختلافی مباحث اور خطیبانہ انداز سے گریز کرتے ہوئے ایسے بنیادی موضوعات پر توجہ مرکوز کی ہے جو ہر مسلمان کے دینی شعور اور عملی زندگی سے براہِ راست تعلق رکھتے ہیں۔ یہی اعتدال اس کتاب کو عام قارئین کے ساتھ ساتھ طلبہ، ائمہ، خطباء اور دینی علوم کے طالب علموں کے لیے بھی مفید اور قابلِ مطالعہ بناتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس حقیقت کو مؤثر انداز میں اجاگر کرتی ہے کہ قرآنِ کریم سے حقیقی وابستگی محض اس کے فضائل کے علم سے نہیں بلکہ اس کے پیغام کو سمجھنے اور عملی زندگی میں اختیار کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی فکر پوری تصنیف کو ایک واضح فکری وحدت عطا کرتی ہے اور اسے محض فضائلِ قرآن کے روایتی بیان سے آگے بڑھا کر ایک دعوتی اور اصلاحی مطالعہ بنا دیتی ہے۔ علمی، دعوتی اور اصلاحی لٹریچر میں یہ کتاب ایک مفید اضافہ ہے۔

(انیس احمد سیوانی ۔anisahmadalig@gmail.com)

ڈاکٹر غلام سرور، بنگال کا فارسی ادب: عہد سلاطین میں، صفحات: ۳۸۴، عثمانیہ بک ڈپو، کلکتہ، ۲۰۲۴ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۳۳۰۵۰۶۳۴۔

بنگال کی سرزمین کو مختلف قوموں، حکمرانوں اور تاجروں کی شروع سے ہی توجہ حاصل رہی ہے۔ اس کی تہذیبی، علمی، تعلیمی، لسانی، ادبی، ثقافی اور سیاسی تاریخ کا مطالعہ مختلف زاویوں سے کیا گیا ہے۔ اس خطۂ ارض پر تاریخ اسلام کا ایک روشن باب آٹھویں نویں صدی عیسوی میں اس وقت لکھا گیا جب اس خطے میں بزرگان دین اور صوفیائے کرام کی آمد ہوئی۔ انہوں نے اس علاقے کو دعوت دین اور اشاعت اسلام کا مرکز بنایا اور امن وامان اور انسانی مساوات واحترام کی باد نسیم سے اس کی فضا سازگار ہوئی۔ مسلمانوں نے تیرہویں صدی عیسوی میں بنگال میں حکومت قائم کی جس کو مؤرخین ''عہد سلاطین'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی عہد سلاطین (۱۲۰۴ء-۱۵۷۶ء) میں یہاں فارسی ادب کی نشو ونما اور ترقی ہوئی۔ بنگال میں فارسی ادب کی تاریخ کا بھرپور مطالعہ اس خاص نقطۂ نظر سے اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ لائق مصنّف نے فارسی زبان وادب کے عہد بہ عہد ارتقاء کی تاریخ کا جائزہ جس باریک بینی سے اس کتاب میں لیا ہے وہ لائق تحسین اور ان کا عظیم الشان علمی کارنامہ ہے۔

یہ اصل میں مصنّف کا تحقیقی مقالہ ہے جو ۲۰۱۷ء میں پہلے انگریزی میں *Persian Studies under the Sultans of Bengal* کے نام سے منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد مصنّف نے اس کو اردو قالب عطا کیا۔ گیارہ ابواب پر مشتمل اس کے پہلے باب میں بنگال کے محل و قوع، وجہ تسمیہ، قدیم نسلوں، آبادیوں، زبانوں، مذہبوں، عقیدوں اور مسلمانوں کی آمد کا مفصل حال لکھا ہے۔ دوسرا باب ایرانی تہذیب و ثقافت سے متعلق ہے جس میں ہندوستان سے ایران کے دیرینہ روابط، ہندوستان پر اس کے اثرات، فارسی زبان و ادب کے آغاز پر بحث کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں دہلی سلطنت کے گورنروں کے عہد میں امراء، شعراء اور ادباء۔ چوتھے باب میں سلاطین بلبن، پانچویں میں سلاطین تغلق، چھٹے میں الیاس شاہی کے پہلے اور ساتویں میں الیاس شاہی کے دوسرے دور، آٹھویں میں حسین شاہی اور نویں میں سور اور کرانی عہد کے علماء ومشائخ کی علمی و ادبی خدمات کا جامع احاطہ کیا گیا ہے۔ دسویں باب میں فارسی زبان و ادب کے ارتقاء میں مسجدوں اور مدرسوں کے کردار اور اس عہد میں اسلامی نظام تعلیم، مدرسوں کے نصاب و نظام تعلیم کے ساتھ ساتھ تعلیم وتربیت کے فروغ میں خانقاہوں کے رول کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے۔ گیارہواں باب بنگال کے فارسی کتبات و مسکوکات کے عنوان سے ہے جس میں عہد سلاطین میں کتبہ نویسی کی روایت، عربی وفارسی کتبات کی تعداد اور اس کے اولین نمونوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختتامیہ کے بعد دو ضمیمے ہیں۔ پہلے میں صوبہ داران وشاہان بنگال کی فہرست اور دوسرے میں ایک نایاب قصیدہ اور دو مکتوب ہیں۔ کتاب کے اندرونی صفحات میں حسب موقع بنگال کے اطراف کے علاقوں اور بزرگوں کے مزارات و مدارس کے نقشہ جات بھی دیے گئے ہیں۔

کتاب کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں عہد سلاطین میں فارسی ادب کا محققانہ مطالعہ واحاطہ اس انداز سے کیا گیا ہے کہ ادبی تصویر کے ساتھ ساتھ بنگال کے سیاسی، علمی، تعلیمی، دینی، تمدنی، معاشرتی، اخلاقی اور ثقافتی منظر نامے کی جھلک بھی سامنے آگئی ہے۔ کتاب مستند، اعلیٰ تحقیقی معیار، عمدہ تحلیل و تجزیے اور اپنے موضوع پر دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ بنگال کے علمی و تاریخی موضوعات پر لکھنے والوں کے لیے تحقیق کے نئے پہلو فراہم کرتی ہے۔ (کلیم صفات اصلاحی)

ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی، مسلم یونیورسٹی اور ۱۹۶۵ء، صفحات: ۳۶۸، دینی تعلیمی کونسل، لکھنؤ، ۲۰۲۶ء، قیمت: ۱۰۰۰روپے، موبائل نمبر: ۷۳۹۰۰۲۶۸۰۸۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بیش قیمت متاع بلکہ ہندوستانی جمہوریت اور سیکولرزم کا ایک روشن اور تابناک چہرہ ہے۔ مسلمانوں نے اس کو غلام ہندوستان میں بنایا اور اس کو پل پل ترقی سے ہم کنار کرتے رہے۔ برطانوی عہد میں یہ ریشہ دوانیوں سے محفوظ رہی لیکن آزادی کے بعد اس کے خلاف سازشیں شروع ہوئیں۔ ۱۹۶۵ء میں وائس چانسلر علی یاور جنگ نے پچھتر فیصدی کے قانون کو بدلنے کا فیصلہ کیا اور کہا کہ اس کی فرقہ واریت ختم کر کے اس کو ایک قومی یونیورسٹی بنایا جائے گا۔ طلبہ نے اس فیصلے کے خلاف شدید احتجاج کیا۔ اس واقعے کو بہانہ بنا کر مسلم یونیورسٹی کی شناخت اور اس کے اقلیتی کردار کو ختم کرنے کا فیصلہ ہوا اور ۲۰ مئی ۱۹۶۵ء کو صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن کے دستخط سے آرڈیننس جاری ہوا اور وہ یونیورسٹی ایکٹ معطل ہو گیا جس کے مطابق اس ادارے کو خود مختاری کا قانونی حق حاصل تھا۔ یونیورسٹی کی اس داستان بلاخیز سے موجودہ نسل کم ہی واقف ہو گی۔

اس واقعے کے بعد اس کی بحالی اور یونیورسٹی کو دوبارہ اس ایکٹ کے تحت لانے کی اس زمانے میں جو انتھک کوششیں ہوئیں، پیش نظر کتاب اس کی ایک ایک پرت کھولتی اور اس ضمن میں لائق مطالعہ مواد فراہم کرتی ہے۔ مسلمانوں نے حکومت کے فیصلے کے خلاف متعدد کامیاب کنونشن منعقد کیے۔ انگریزی اور اردو اخبارات ندائے ملت وغیرہ میں پر اثر مضامین لکھے گئے۔ قاضی محمد عدیل عباسی، قاضی جلیل عباسی، منشی احترام علی، ڈاکٹر سید محمود، محمد یسین نوری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبد الماجد دریابادی، ڈاکٹر عبد الجلیل فریدی اور ظفر احمد صدیقی وغیرہ نے خاص طور پر اس اہم مسئلے کے حل کے لیے پورا زور لگایا۔ اس کی تفصیل ان دانشوروں کے قلم سے اس کتاب میں جمع کی گئی ہے۔ پٹنہ میں احتجاجی جلسے کی رپورٹ، اولڈ بوائز کا میمورنڈم، کنونشنوں میں دیے گئے استقبالیہ، افتتاحیہ اور صدارتی خطبات اور تقریریں بھی اس میں موجود ہیں۔ بعض مضامین میں ہنگامے کی حقیقت اور اس کے اصل ذمہ داروں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بعض میں آرڈیننس کی قانونی حیثیت واضح کی گئی ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (امنڈمنٹ) ایکٹ بل کا انگریزی متن بھی کتاب میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ڈی مالویہ جی ایم پی کے نام عدیل عباسی کے ایک مفصل انگریزی خط کا متن بھی شامل کتاب ہے۔

بہر حال اس مسئلے نے اس زمانے میں مسلمانوں کے اندر بیداری پیدا کر دی تھی اور مسلم یونیورسٹی

کے حق میں فضاساز گار ہو گئی تھی لیکن دو سال بعد اس مسئلہ کو سیاسی رخ دیا گیا تو حالات بدل گئے اور نتائج امید کے بر خلاف ظاہر ہوئے اور آج تک اس کا "اقلیتی کردار" بحال نہ ہو سکا۔

مصنّف کہنہ مشق اہل قلم اور ادیب ہیں۔ "صبح ادب" کے مدیر رہ چکے ہیں۔ ان کی تصنیفی و تالیفی خوش سلیقگی، علم دوستی، ادب شناسی اور صحافتی خوش ذوقی کا ایک زمانہ قائل ہے۔ ان کا سینہ و دماغ گزشتہ پچاس سالہ علمی، تعلیمی، دینی، ملی اور سیاسی تاریخ کے انقلابات کا مخزن و محافظ ہے۔ یہ اور ان کی دوسری تصنیفات جیسے مولانا آزاد، احوال و آثار، تحریر بے عدیل، یادنو بہار اور متاع فقیر اس کی گواہ ہیں۔ اس کتاب کا مطالعہ اس لیے ضروری ہے کہ اس سے غیروں کے استحصال اور ملت کے کمال کا اندازہ ہو گا۔ اپنے پرائے کا امتیاز نظر آئے گا اور ایک روشن مستقبل کی بازیافت آسان ہو گی۔ امید کہ یہ عمدہ علمی خدمت علی گڑھ کے علمی و ادبی حلقے میں بہ طور خاص حسن قبول حاصل کرے گی۔ (ک۔ص۔اصلاحی)

مفتی احمد اللہ نثار قاسمی نقشبندی مجددی، کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ جبراً تبدیلیٔ مذہب حقائق اور غلط فہمیاں، دارالعلوم رشیدیہ، حیدر آباد، ۲۰۲۵، صفحات: ۲۲۵، قیمت: ۳۰۰ روپے۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اس نے جب اپنی انقلابی تعلیمات دنیا کے سامنے پیش کیں تو ۲۳ سال کے قلیل مدت میں جو مثبت انقلاب رونما ہوا، آج تک دنیا اس کی کوئی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اقوامِ عالم کی متعصبانہ سوچ کے بر خلاف اسلام نے مذہبی رواداری اور بین الاقوامی ہم آہنگی کا درس دیتے ہوئے یہ واضح ہدایات جاری کی ہے کہ عقیدہ، مذہب، فکر اور تہذیب کے حوالے سے ہر شخص کو آزادی حاصل ہے، کوئی کسی پر جبر و اکراہ نہ کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: لاَ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرہ: ۲۵۶) (دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے، صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے)۔ تمام انسانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ چنانچہ سورۃ الکہف: ۲۹ میں ہے: فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ (جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کرے)۔ اللہ تعالیٰ نے واضح الفاظ میں اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی یہ اعلان کرادیا: لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ (الکافرون: ۶) (تمہارے لئے تمہارا دین اور میرے لئے میرا دین) اور قرآن مجید نے مسلمانوں کو عقیدے و مذہب کے سلسلے میں قطعی طور پر جبر و اکراہ سے منع کرتے ہوئے فرمایا: أَفَأَنتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُواْ مُؤْمِنِين (سورہ یونس: ۹۹)

(کیا تم لوگوں کو مجبور کروگے کہ وہ مؤمن بن جائیں؟)۔

اسلام انسان کے فطری تقاضوں کا خیال رکھتا ہے۔ اس لئے وہ اس معاملے میں کسی طرح جبر واکراہ کی بالکل اجازت نہیں دیتا، البتہ دنیا کو اسلام کی دعوت حکمت وموعظت حسنہ کے ساتھ ضرور دی جائے۔ پھر لوگوں کو اختیار ہے چاہیں تو اسے قبول کریں، چاہیں تو نہ کریں۔

زیر تبصرہ کتاب نو ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں کیا اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، کیا دیگر لوگوں کو جبراً تبدیلیٔ مذہب پر مجبور کیا گیا ہے؟ جیسے سوالات کے جواباب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ نیز اس سلسلے میں جو حقائق اور غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، ان کو آشکارا کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں اشاعت اسلام کی وہی بدنام زمانہ تھیوری ہے جس میں کہا جاتا ہے کہ دنیا میں اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ یہی بات مشہور مستشرق ولیم میور نے لکھی تھی۔ اس تعلق سے اس ملک میں جو غلط فہمیاں پھیلائی گئیں ان کے پیچھے دو گروہ پیش پیش تھے اول انگریز، دوم ہندو۔ انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں عیسائیت کی بالا دستی کو قائم کرنے کے لیے اسلام پر مختلف پہلوؤں سے حملے کیے اور اسلام کو ایک غیر متمدن اور فرسودہ مذہب ثابت کرنے کے لیے ہر طرح کی زور آزمائی کی، لیکن اللہ تعالیٰ نے مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مولانا قاسم نانوتویؒ جیسی شخصیات پیدا کیں جنہوں نے پادری فنڈر جیسے انگریز مناظروں کی عیاریوں کو بے نقاب کر دیا۔ اس کے علاوہ ان اکابر علماء کے عیسائیوں، آریہ سماج کے بانی سوامی وویکانند اور قادیانیوں سے کامیاب مناظرے ہوئے۔

ہمارے ملک عزیز میں ایک خاص پارٹی برسوں سے برسرِ اقتدار ہے۔ اس کے عمل سے واضح ہو چکا ہے کہ وہ اس جمہوری ملک پر ہندو تہذیب کا غلبہ چاہتی ہے۔ اس کے لیے وہ ہر طرح کے حربے استعمال کر رہی ہے۔ کبھی اسلاموفوبیا کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے، اور آزادیٔ رائے کی غلط تشریح سے محمد ﷺ کی شان میں گستاخیاں کی جاتی ہیں اور جب مسلمان سپریم کورٹ میں اس کے خلاف کیس درج کراتے ہیں تو سپریم کورٹ آرٹیکل ۳۲/ کے تحت عرضی دائر کرنے پر سوال اٹھاتا ہے اور یہ کہہ کر اپنا دامن بچاتا ہے کہ "یہ ایسا معاملہ نہیں ہے، جس میں آرٹیکل ۳۲/ کے دائرہ کو استعمال کیا جائے" (روزنامہ انقلاب، وارانسی ایڈیشن، ۱۶/ جولائی ۲۰۲۶ء)۔

اس ملک میں آج میڈیا کے پروپیگنڈے کے زور پر اسلام کی تصویر خراب کی جا رہی ہے۔ اس

کے لیے ڈراموں، افسانوں، فلموں، دیومالائی قصوں، فرضی کہانیوں کا سہارا لے کر شب وروز تماشا کیا جارہا ہے۔ اور اس سے آگے بڑھ کر تاریخ نویسی نہیں بلکہ تاریخ سازی کی جارہی ہے (ص ۳۱)۔

ہندوستان میں جزیہ کا مسئلہ کب پیش آیا؟ اس سوال کا جواب مصنف نے پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی کی کتاب ”اسلامی قوانین کی ترویج وتنفیذ: عہد فیروز شاہی میں“ (ص ۳۷) کے حوالے سے لکھا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلے یہ مسئلہ محمد بن قاسم کے زمانے میں پیش آیا، جب وہ سندھ میں حکومت قائم کررہے تھے (ص ۱۱۵)۔

ایسے ہی مصنف نے ہندوستان میں اشاعت اسلام کے اسباب پر غور کرنے کی دعوت اہل علم ودانش کو دی ہے، اور یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ:

> اول یہ کہ یہاں اشاعت اسلام کی رفتار بہت سست رہی ہے اور دوسرے یہ کہ دیگر علاقوں بالخصوص مشرق وسطیٰ کے طرز پر اسلام پورے علاقے میں نہیں پھیل سکا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہندوستان میں اشاعت اسلام کے پروسیس کا معروضی مطالعہ کیا جائے اور ان حقیقی اسباب کا پتہ لگایا جائے، جن کے سبب اسلام پھیلا۔ اسی طرح ان وجوہات کا جاننا بھی ضروری ہے جن کے سبب اشاعت اسلام اس خطے میں متاثر رہی (ص ۱۸۰)۔

مجموعی لحاظ سے کتاب لائق استفادہ ہے۔ نوجوان نسلوں کو اس طرح کی کتابیں اپنے مطالعہ میں ضرور رکھنا چاہیے۔ (فضل الرحمن اصلاحی)

مولانا محمد ثاقب اعظمی (قاسمی)، خواتین اسلام کے سبق آموز واقعات، مکتبہ عبدالعلیم غوث پور، ماہل، اعظم گڑھ، ۲۰۲۵ء، صفحات: ۳۸۴، قیمت درج نہیں۔

عورتوں کی تعلیم وتربیت کے مسئلے سے اصولاً کسی کو اختلاف نہیں ہے۔ گفتگو جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دور کی تعلیم وتربیت کے نتیجے میں ایک مسلمان عورت مذہب، اخلاق اور معاشرت کے قدیم اصول کو قائم کرسکے گی یا نہیں؟

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے بہت سی صحابیات کے علاوہ اولوالعزم اور باہمت خواتین کے واقعات کو عصری اسلوب میں مرتب کیا ہے۔ مولانا نے خواتین اسلام کے سبق آموز بکھرے واقعات کو ایک گلدستہ کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چوں کہ خواتین کو واقعات اور قصے کہانیوں سے زیادہ دل چسپی ہوتی ہے، اس لئے ایسے واقعات اگر گھروں میں پڑھنے کو

معمولات بنائے جائیں تو گھروں میں پاکیزہ تبدیلی لازمی طور پر آئے گی۔ مرد حضرات مساجد اور جلسوں وغیرہ کی تقریروں سے مستفید ہو جایا کرتے ہیں لیکن عورتیں عام طور پر محروم رہ جاتی ہیں۔

اس کتاب میں ایک واقعہ مولانا محمد قاسم ناتویؒ کی اہلیہ کا جذبۂ اطاعت کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔ مصنف نے "سوانح قاسمی" کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولانا نانوتویؒ نے اپنی دلہن کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا دیکھو! تم ایک امیر رئیس کی صاحبزادی اور میں فقیر وغریب اور مسکین انسان ہوں۔ نکاح کے بعد اب تمہارا اور میرا جینا ایک ساتھ ہو گیا ہے کہ ہمارا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ ہے؛ مگر یہ نبھاؤ بظاہر مشکل ہو گا کہ تم امیر کی بیٹی ہو، میں فقیر ہوں اور فقر کو پسند کرتا ہوں، ہمارا گزر تب بہتر ہو سکے گا جب ہم دونوں ایک ہو جائیں۔ یہ سن کر نئی نویلی دلہن نے جواب دیا کہ میں فقر و غربت کی راہ اختیار کرتی ہوں، اور میرے سارے زیورات آپ کی ملکیت ہیں اور آپ کو اختیار ہے جہاں چاہیں انہیں استعمال کریں۔ مولانا نے وہ تمام زیورات اپنی دلہن سے اتار لیے اور صبح کو بلقان کی جنگ میں مسلمانوں کی اعانت و نصرت کے لیے چندہ میں جمع کر دیے (ص ۳۱۵)۔

اس کتاب میں روایت کا پہلو غالب ہے۔ درایتاً بعض واقعات تحقیق پر کھرے نہیں اترتے۔ مثلاً: ایک جگہ لکھا ہے کہ:

> حضرت یوسف علیہ السلام کو جب مصر کے بازار میں بیچا جارہا تھا، تو ان کو خریدنے کے لیے ایک بوڑھی عورت بھی گئی تھی۔ کسی نے پوچھا کہ اماں! تم کہاں جارہی ہو؟ کہنے لگیں کہ یوسف علیہ السلام کو خریدنے جارہی ہوں۔ اس نے کہا: ان کو خریدنے کے لیے بڑے بڑے امیر آئے ہوئے ہیں، تو یوسف علیہ السلام کو کیسے خرید سکے گی؟ کہنے لگی کہ "۔۔۔ کل قیامت کے دن جب اللہ رب العزت کہیں گے کہ میرے یوسف کو خریدنے والے کہاں ہیں؟ تو میں بھی یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں شامل ہو سکوں گی" (ص ۳۱۳-۳۱۴)۔

مندرجہ بالا واقعہ نہ کسی معتبر تاریخی کتاب میں مذکور ہے، نہ ہی اس کو مولانا حفظ الرحمن سیوہاریؒ نے قصص القرآن میں لکھا ہے اور نہ ہی مولانا ابو الکلام نے اپنی معروف کتاب "حضرت یوسف" میں تحریر کیا ہے۔ اس طرح کے واقعات گرمیٔ محفل کے لیے ایجاد کیے جاتے تھے۔

مجموعی اعتبار سے کتاب مفید ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب حلقۂ خواتین میں مقبول ہو گی اور اس کتاب سے بھی خاطر خواہ استفادہ کیا جائے گا۔　　　　(ف۔ اصلاحی)

نعت

ڈاکٹر راہیؔ فدائی
بنگلور (کرناٹک، بھارت)
موبائل نمبر: ۹۴۴۸۱۶۶۵۳۶

ماورائے ابد ہے نورِ ازلؐ
سب اندھیروں کا رد ہے نورِ ازلؐ

کُن فکاں! تیرے قصر شاہی میں
مقتضائے احد ہے نورِ ازلؐ

ہے جو مشکوٰۃ نور سینۂ پاک
دل بھی مصباح صد ہے نورِ ازلؐ

رشک کرتی ہیں سرو قد حوریں
آپؐ کا حسن قد ہے نورِ ازلؐ

ہے نہایت کرم میں، بخشش میں
رحم میں بھی نہ حد ہے نورِ ازلؐ

حرف معجز کا اعتبار تو ہے
خامشی بھی سند ہے نورِ ازلؐ

حیرتی ہے کمال وصف بھی خود
بوالعجب یہ خرد ہے نورِ ازلؐ

استعارہ ہے اول و آخر
ہے نیاز عدد ہے نورِ ازلؐ

وحدہٗ لاشریک، وہ بھی ہے
شرک سے نابلد ہے نورِ ازلؐ

جس سے روشن ہیں بے شمار ارواح
وہ چراغ جسد ہے نورِ ازلؐ

آپؐ کے اذن سے مسخر ہے
نفس ورنہ اسد ہے نورِ ازلؐ

قلب و رخ سے عیاں ہے نور ہی نور
ظلمتوں کو حسد ہے نورِ ازلؐ

نعت روشن کہی ہے راہیؔ نے
آپؐ ہی کی مدد ہے نورِ ازلؐ

نعت

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
نعمانی منزل، نزد ابو ہریرہ مسجد، ہمدرد نگر، جمال پور، علی گڑھ
موبائل نمبر : ۹۸۹۷۸۲۰۷۷۷

بن جائے گی بات ہماری کرتے کرتے آپؐ کی بات
آخر حق کی شمع جلے گی ہو کیسی اندھیاری رات
دنیا میں جتنے عمل ہیں اچھے اور ہے جو بھی اچھی بات
یہ سب انسانوں کے لیے ہیں آپؐ کی سیرت کی برکات
دنیا کی تاریخ میں یوں تو کتنے رہبر آئے گئے
ممکن ہو تو کوئی دکھائے ایسی سیرت ایسی ذات
فکر و نظر کے سارے دھوکے ایک نظر سے ختم ہوئے
روشن ہوگئے ایک سخن سے سب اَفہام و ادراکات
کعبے سے اقصیٰ ، اقصیٰ سے سدرہ، سدرہ سے تا عرش بریں
اک پل میں وہؐ گئے اور آئے، تھی کیسی وہ نرالی رات
آپؐ کا کلمہ، آپؐ کا دعویٰ، آپؐ کا وہ دل کش پیغام
دو لفظوں میں دو جملوں میں سب شرحِ نفی و اثبات
انؐ کا تقدس ، انؐ کی طہارت، انؐ کا ترفع، انؐ کا عروج
کس کی زباں اور کیسی عبارت ، ہیچ ہیں الفاظ و اصوات
کس نے پائی ان کے سوا ، کب اتنی بلندی تک معراج
کس کے زیر قدم تھے آئے سب افلاک اور سب سموات
رب کا کرم ہے بے شک اس نے بخشی یہ توفیق مجھے
انؐ کی نعت رئیس لکھوں میں ، کیا میں ، کیا میری اوقات

معارف کی ڈاک

سیرت النبی کا عربی ترجمہ

"سیرت النبی" بین الاقوامی سطح پر لکھی گئی کتب سیرت میں اپنا جو مقام رکھتی ہے وہ اہل علم سے مخفی نہیں، اگر یہ کتاب اسی وقت عربی میں لکھی جاتی تو شاید اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے ہوتے اور وہ پوری دنیا میں عام ہو گئی ہوتی، لیکن ملک کے اہل علم کی ضرورت کے پیش نظر علامہ شبلی نے اردو ہی میں لکھی اور علامہ سید سلیمان ندوی نے اسی زبان میں پوری کی، جب کہ دونوں بزرگوں کی عربی انشانگاری بہت معیاری تھی، اور بہت آسانی سے وہ معاصر اور سلیس عربی زبان میں یہ کتاب مرتب کرسکتے تھے، جس سے انہیں مزید آسانی ہوتی اور بہت سے عربی متون کا ترجمہ کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ لیکن ان دونوں بزرگوں کی شہرت کی وجہ سے عالمی سطح پر یہ کتاب جلد ہی متعارف ہو گئی تھی، گرچہ عرب علماء اس کے مشمولات سے واقف نہیں ہو سکے، لیکن خود علمائے عرب کی طرف اس کی تعریب کا مطالبہ بہت پہلے شروع ہو گیا تھا اور اس کی کوششیں بھی انہیں کی طرف سے ہونے لگی تھیں۔ چنانچہ علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ معارف کے شذرات میں ایک موقع پر لکھتے ہیں: "یہ خبر بھی مسرت افزا ہو گی کہ مکہ معظمہ کے چند ادبا نے مل کر تہیہ کیا ہے کہ دارالمصنّفین کی سیرۃ النبی اور سیرۃ عائشہ کا ترجمہ عربی زبان میں کریں۔ شیخ رشدی الصالح ملحسی اڈیٹر ام القریٰ اس تجویز کے محرک ہیں۔ اگر یہ ترجمے واقعاً چھپ کر شائع ہو گئے تو امید ہے کہ دنیائے اسلام کے مردوزن کے سامنے اسلام کے دونوں صنفوں کے بہترین نمونے آجائیں گے" (شذرات سلیمانی، دسمبر ۱۹۳۳، جلد سوم، ص ۳۶)۔

لیکن یہ کام اس وقت نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد بھی متعدد عرب اہل علم اور ندوی فضلاء نے اس کی کوشش کی کہ سیرت النبی کا عربی ترجمہ کیا جائے۔ متعدد تحریروں میں استاد عبدالوہاب عزام سفیر مصر برائے پاکستان کا نام بھی ملتا ہے جو علامہ سید سلیمان ندوی سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے اور اس کا ترجمہ خود کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے بعد بھی کام نہیں ہو سکا پھر مولانا اسماعیل ندوی مدراسی نے مصر کے دوران قیام سیرت النبی کی دو جلدوں کا ترجمہ کیا، اور ایک اطلاع کے مطابق اس کی کاپی جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں محفوظ ہے (معارف جون ۱۹۹۷) لیکن وہ بھی شائع نہیں ہو سکا۔

اس کے بعد قاہرہ کے دارالترجمہ سے سیرۃ النبی کی تمام جلدوں کا ترجمہ شائع ہوا، جو متعدد مصری اہل علم کے قلم سے ہے، لیکن ان کی اردو کمزور ہونے کی وجہ سے بھی اور دیگر اسباب کی وجہ سے بھی اس ترجمہ کو نہ کوئی پذیرائی حاصل ہوئی نہ اس کتاب کا عالم عربی میں تعارف ہو سکا۔

اس کے بعد کئی اہل علم نے کوشش کی بلکہ شاید اس کے ایک حصہ کا ترجمہ بھی کیا گیا لیکن کل امر مرھون باوقاتہ اور کم ترک الاول للآخر کے تحت یہ سعادت ممتاز عالم مولانا رحمت اللہ ندوی کے لئے مقدر تھی، جو ایک درجن سے زائد عربی کتابوں کے مصنف ہیں، اور سید صاحب کی بعض کتابوں کے عربی ترجمے بھی ان کے قلم سے شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے منظم طور پر اس کام کا آغاز کیا، جس میں ان کے متعدد ندوی رفقا کی شرکت رہی، اور سب کی توجہ اور محنت سے نہ صرف اس عظیم الشان کتاب کا عربی ترجمہ بلکہ جامع اور علمی حواشی کے ساتھ دارالقلم دمشق سے اس کا بہت ہی خوبصورت اور معیاری ایڈیشن منظر عام پر آیا ہے، اور عالم عربی میں جلد ہی متعارف ہو گیا۔ دوحہ (قطر) کے عالمی کتاب میلے میں یہ پہلی بار منظر عام پر آئی اور بڑی تعداد میں فروخت ہوئی۔

طلحہ نعمت ندوی
talhanemat3@gmail.com

معارف: سیرۃ النبی کے عربی ترجمے کے بارے میں آپ کے مراسلے کا شکریہ۔ ہماری اطلاع کے مطابق یہ ترجمہ صرف رحمت اللہ ندوی نے نہیں کیا ہے بلکہ اس میں دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ آپ کے مراسلے میں ان دوسرے لوگوں کے نام بھی آنے چاہئیں۔ ہم کو اس ترجمے کی اطلاع عرصے سے ہے لیکن یہ ترجمہ اب تک خود دارالمصنفین کو فراہم نہیں کیا گیا ہے* اور نہ ہی اس کو ترجمہ کرنے کے لیے اجازت ادارے سے لی گئی ہے۔ جب ترجمہ کرنے والوں میں شریک ایک صاحب کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو وہ بدتمیزی پر اتر آئے۔ سیرۃ النبی دارالمصنفین کا سب سے بڑا کام ہے اور اس کی فروخت سے دارالمصنفین کے اخراجات کا ایک حصہ پورا ہوتا ہے۔ اس کی اردو یا کسی اور زبان میں ترجمہ واشاعت کے لیے ادارے سے اجازت لینا ضروری ہے اور اسی کے ساتھ کچھ معقول معاوضہ بھی ادارے کو ملنا چاہیے۔ ترجمے کی اشاعت سے پہلے بھی ترجمے کو ہمیں دکھالیا جانا چاہیے تھا تاکہ اس کے معیار کے بارے میں اندازہ ہو جاتا۔ صرف عرب ممالک میں رہنے یا وہاں پڑھنے سے معیاری عربی نہیں آتی ہے بلکہ اس کے لئے بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں (من طلب العلی سھر اللیالی)۔ اس سے پہلے سیرۃ النبی کا ترجمہ کچھ مصری فضلاء نے کیا جن کو ٹھیک سے اردو نہیں آتی ہے جس سے اس کے بارے تاثر خراب ہوا۔ مولانا ابوالاعلی مودودی اور مولانا وحید الدین خان کی کتابوں کے اس طرح کے ترجمے صرف جوش اور مالی منفعت کے لیے کیے گئے لیکن وہ اتنے ناقص تھے کہ ان ترجموں سے ان کے مصنفین کی حیثیت مجروح ہوئی۔ موجودہ ترجمے کو دیکھے بغیر اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک دیدہ دلیری کا معاملہ رہے گا کیونکہ

* یہ کتاب اس مراسلے کے جواب لکھنے کے بعد ۲۱/ اگست ۲۰۲۶ کو دارالمصنفین میں موصول ہوئی (ادارہ)۔

ادارے سے نہ اجازت لی گئی ہے اور نہ اس کو اس عظیم کتاب کے ترجمے کے بدلے کوئی معاوضہ دیا گیا۔ ہماری اطلاع کے مطابق اس ترجمے کے اخراجات کا بار جنوبی افریقہ میں مقیم علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم کے کسی عزیز نے اٹھایا ہے۔ (ڈاکٹر ظفر الاسلام خان)

ماہ نامہ معارف کا تازہ شمارہ جولائی ۲۰۲۶ء باصرہ نواز ہوا۔ تبصرۂ کتب کے کالم میں مولانا فضل الرحمٰن اصلاحی کا تبصرہ بر کتاب ''تدبر قرآن پر ایک نظر'' (مولانا جلیل احسن ندویؒ، ترتیب و تعلیق: مولانا نعیم الدین اصلاحی) پڑھا۔ مبصر محترم نے مولانا جلیل احسن ندویؒ کے مختصر اور جامع تعارف کے ساتھ مشمولاتِ کتاب اور کتاب میں درج تفسیری آرا کی حیثیت اور نوعیت پر گفتگو کی ہے۔ انھوں نے غالباً عجلت میں اپنے تبصرے میں یہ بات لکھ دی ہے کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ نے جس طرح ''تدبر قرآن'' پر ایک نگاہ ڈالی ہے، اسی طرح ''تفہیم القرآن'' (مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ) پر بھی تنقیدیں کی ہیں اور بہ طور حوالہ ماہ نامہ زندگی رام پور میں شائع شدہ مضمون ''تقصیراتِ تفہیم پر ایک نظر'' [ستمبر ۱۹۸۱ء] کا ذکر کیا ہے۔ واضح رہے کہ مولانا جلیل احسن ندویؒ کا یہ 'تفہیم القرآن' پر تنقیدی مضمون نہیں ہے، بلکہ یہ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری کی کتاب ''تقصیرات تفہیم یعنی تفہیم القرآن کا مکمل اور مدلل جائزہ'' (ناشر مکتبہ عبادیہ نہٹور ضلع بجنور، یوپی، سن طباعت ۱۹۷۹ء، صفحات ۲۴۲) پر نقد ہے۔ اس میں انھوں نے مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری کی تفہیم القرآن پر تنقیدات کا علمی جواب دیا ہے، تفہیم القرآن پر مولانا جلیل احسن ندویؒ کا کوئی تنقیدی مضمون کسی رسالے میں کبھی شائع نہیں ہوا ہے۔ (محمد انس فلاحی مدنی، معاون مدیر، مجلّہ سہ ماہی تحقیقاتِ اسلامی، علی گڑھ)

anasfalahi@gmail.com

معارف: یہ بات پڑھ کر مجھے بھی تعجب ہوا تھا کیونکہ میں مولانا جلیل احسن مرحوم کو جانتا تھا اور وہ میرے علم میں جماعت اسلامی کے رکن تھے جن سے ایسی تنقید متوقع نہیں تھی۔ (مدیر)

تبصرہ نگار: یہ غلطی مجھ سے سہواً واقع ہوگئی۔ کسی نے مجھ سے کہا نہیں تھا۔ میں نے اپنے مضمون ''مولانا جلیل احسن ندویؒ کی قرآنی بصیرت'' میں اس کی اصلاح کر دی ہے (فضل الرحمن اصلاحی)۔

شعر کی نسبت

معارف کے جنوری ۲۰۲۶ کے شمارے میں ''مابعد جدیدیت اور اردو ادب کا جدلیاتی رویہ'' نظر سے گزرا تو ایک شعر صفحہ ۵۸ پر پڑھا:

وہ گاؤں کا ایک ضعیف دہقان، ۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

یہ شعر احمد سلمان صاحب کا ہے نہ کہ عرفان ستار کا۔

الیاس حسن
elyashassan195@g

رسید کتب موصولہ

پروفیسر محمد طاہر، **اردو زبان وادب** (تاریخ وتنقید، جلد اول ودوم): جی۔ این۔ کے پبلی کیشنز، نئی دہلی، صفحات: بالترتیب ۸۱۵، ۶۷۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت بالترتیب: ۹۵۰، ۸۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۵۴۱۱۲۳۱۱۰

ڈاکٹر سلیمان بن حمد العودۃ، ڈاکٹر محمود حافظ عبدالرب مرزا (مترجم)، **اصحاب بدر** (مختصر سوانح اور کارنامے): الکتاب انٹرنیشنل، جامعہ نگر، نیو دہلی، صفحات: ۴۴۹، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۱۲۵۰۸۷۶۲

ڈاکٹر رفیق احمد، **انتخاب کلام فضا ابن فیضی**: اترپردیش اردو اکیڈمی، گومتی نگر، لکھنؤ، صفحات: ۱۴۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۱۳۱روپے، ای میل: upurduakademi3@gmail.com

مولانا محمد منظور نعمانی، **تذکرہ شاہ ولی اللہؒ**: الفرقان بک ڈپو، نظیر آباد، لکھنؤ، صفحات: ۴۸۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۶۵۰روپے، موبائل نمبر درج نہیں

علامہ عبدالحمید فراہی، ڈاکٹر احمد حسن فرحات وڈاکٹر محمد اقبال احمد فرحات (مرتبین)، **جمھرۃ البلاغۃ**: جائزۃ دبیّ الدولیۃ للقرآن الکریم، پوسٹ بکس: ۲۰۴۲۴، دبئی، یو اے ای، صفحات: ۲۶۶، سالِ اشاعت: ۲۰۱۷ء، قیمت درج نہیں، موبائل نمبر: ۹۷۱۴۲۶۱۰۶۶۶

ڈاکٹر انور شفیق اعظمی، مولانا جاوید اطہر قاسمی (مرتبین)، **جہاتِ ڈاکٹر شکیل**: پاریکھ بک ڈپو، لکھنؤ، صفحات: ۳۵۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۳۸۹۴۵۶۷۸۶

ڈاکٹر ٹی۔ آر۔ رینا، **رشید حسن خاں کے خطوط** (جلد چہارم): البلاغ، پبلی کیشنز، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی، صفحات: ۴۳۲، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۸۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۹۸۲۸۵۴۲

مفتی محمد کلیم الدین قاسمی، **فاتحِ گلبرگہ**: دارالعلوم رحمانیہ تالاب کٹہ، حیدرآباد، تلنگانہ، صفحات: ۲۴۸، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت وموبائل نمبر درج نہیں

ڈاکٹر سید محمد انس ندوی، **قرآن اور جدید سائنس مشاہدات کی روشنی میں**: مکتبہ نعیمیہ، صدر بازار، مئوناتھ بھنجن، مئو، صفحات: ۳۰۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۵ء، قیمت: ۷۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۵۰۷۵۵۸۲۰

ڈاکٹر تبسم صابر، **وفیات برہان**: جھولے والی املی، ڈگری کالج روڈ، رامپور، یوپی، صفحات: ۳۶۸، سالِ اشاعت: ۲۰۱۹ء، قیمت: ۵۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۸۹۷۴۸۳۰۷۰

حکیم فخر عالم، **یونانی طب میں بیاض نویسی کی روایت**: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، علی گڑھ، صفحات: ۱۲۴، سالِ اشاعت: ۲۰۲۶ء، قیمت: ۳۰۰روپے، موبائل نمبر: ۹۴۱۱۶۵۳۰۴۱

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

اسمائے کتب	قیمت	اسمائے کتب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبی (خاص ایڈیشن مکمل ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	125/-
مقدمہ سیرۃ النبی	30/-	سفرنامہ روم ومصروشام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات شبلی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	400/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم اول	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم دوم	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم سوم	150/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم چہارم	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم پنجم	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی واخباری)	150/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن)		انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-
تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل اصلاحی	350/-	مکاتیب شبلی اول 〃 〃 〃	--
خطبات شبلی	150/-	مکاتیب شبلی دوم 〃 〃 〃	--
الکلام	350/-	اسلام اور مستشرقین چہارم	
علم الکلام	200/-	(علامہ شبلی کے مقالات)	250/-

Total Pages: 84 (Including Cover Page)

SEP 2026 Vol- 213(9) ISSN 0974-7346 Ma'arif(Urdu)-Print

RNI. 13667/57 MA'ARIF **AZM/NP- 43/2026-28**

Monthly Journal of

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY

P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)

Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی نئی مطبوعات

روایاتِ سیرت نبویؐ (بلاذری کے حوالے سے)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	450/-
مصادرِ سیرت نبویؐ (مجموعۂ مقالات سیمینار)	مرتبہ: مولانا کلیم صفات اصلاحی	600/-
عہد اسلامی کا ہندوستان: معاشرت، معیشت اور حکومت کے مسائل	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	300/-
وفیات مشاہیر (مولانا ضیاء الدین اصلاحی)	ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں وسلیم جاوید	600/-
دارالمصنّفین کے سوسال (اضافہ شدہ)	مولانا کلیم صفات اصلاحی	500/-

تاریخ ساز ادارے کے معاون خاص بنئے

برصغیر کے قدیم ترین علمی اور تحقیقی ادارہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ کو خود کفیل بنائیے۔ سنہ ۱۹۱۴ سے قائم یہ وہی ادارہ ہے جس نے علامہ شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی سمیت ۲۸۰ بیش قیمت علمی اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔ آج جبکہ تاریخ کے نام پر مسلمانان ہند پر یلغار ہو رہی ہے، اس ادارے کو تقویت دینا اور خود کفیل بنانا پوری ملت کا فرض ہے۔ کم از کم پانچ ہزار روپے سالانہ تعاون فرمائیں۔ اکاؤنٹ کی تفصیل اور QR کوڈ حاضر ہے۔

A/C: DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH
A/C No: 0504010100032752
Bank Name: PUNJAB NATIONAL BANK
Branch: HEERPATTI - AZAMGARH (U.P.)
IFSC: PUNB 0476100 - Bank Code: 476100

Darul Musannefin Shibli Academy
Shibli Road, Azamgarh-276001, U.P.
Contact: Dr Fakhrul Islam Azmi, Dy. Director
Mobile: 99352 33940
Email: info@shibliacademy.org [to inform after remittance]
www.shibliacademy.org

7309301663m1@pnb
Scan and pay with any BHIM UPI
BHIM UPI
G Pay PhonePe Paytm

تعاون بھیج کر اپنے پورے پتہ کے ساتھ ہمیں ای-میل سے مطلع کریں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام خان (ڈائرکٹر)